اختر رضا سلیمی کے ناولوں میں ثقافتی عناصر کا مطالعہ

(”جاگے ہیں خواب میں“ اور ”جندر“ کے حوالے سے)

مقالہ برائے ایم۔فل (اردو)

مقالہ نگار:

رمشہ کنول

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگوئجز، اسلام آباد

©اگست، ۲۰۱۹ء

اختر رضا سلیمی کے ناولوں میں ثقافتی عناصر کا مطالعہ

(”جاگے ہیں خواب میں“ اور ”جندر“ کے حوالے سے)

مقالہ نگار:

رمشہ کنول

یہ مقالہ

ایم۔فل (اردو)

کی ڈگری کی جزوی تکمیل کے لیے پیش کیا گیا

فیکلٹی آف لینگوئجز

(اُردو زبان و ادب)

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگوئجز، اسلام آباد

©اگست، ۲۰۱۹ء

مقالے کے دفاع اور منظوری کا فارم

زیرِ دستخطی تصدیق کرتے ہیں کہ انہوں نے مندرجہ ذیل مقالہ پڑھا اور مقالے کے دفاع کو جانچا ہے، وہ مجموعی طور پر امتحانی کارکردگی سے مطمئن ہیں اور فیکلٹی آف لینگوئجز کو اس مقالے کی منظوری کی سفارش کرتے ہیں۔

مقالے کا عنوان: اختر رضا سلیمی کے ناولوں میں ثقافتی عناصر کا مطالعہ ("جاگے ہیں خواب میں" اور "جندر" کے حوالے سے)

پیش کار: رمشہ کنول رجسٹریشن نمبر:M/U/S17/1329

ماسٹر آف فلاسفی

شعبہ: شعبۂ اردو زبان و ادب

ڈاکٹر عابد حسین سیال _____

نگران مقالہ

پروفیسر ڈاکٹر ارشد محمود _____

ڈین فیکلٹی آف لینگوئجز

بریگیڈیئر محمد ابراہیم _____

ڈائریکٹر جنرل

تاریخ:_____

اقرار نامہ

میں رمشہ کنول حلفیہ بیان کرتی ہوں کہ اس مقالے میں پیش کیا گیا کام میرا ذاتی ہے اور نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگوئجز، اسلام آباد کے ایم۔فل اسکالر کی حیثیت سے ڈاکٹر عابد حسین سیال کی نگرانی میں مکمل کیا گیا ہے۔ میں نے یہ کام کسی اور یونیورسٹی یا ادارے میں ڈگری کے حصول کے لیے پیش نہیں کیا ہے اور نہ آئندہ کروں گی۔

_____

رمشہ کنول

مقالہ نگار

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگوئجز، اسلام آباد

فہرست ابواب

عنوان	صفحہ نمبر
مقالے کے دفاع اور منظوری کا فارم	III
اقرار نامہ	IV
فہرست ابواب	V
Abstract	VIII
اظہارِ تشکر	IX
باب اول: تعارف اور بنیادی مباحث	
الف: تمہید	۱
i۔ موضوع کا تعارف	۱
ii۔ بیان مسئلہ	۱
iii۔ مقاصد تحقیق	۲
iv۔ تحقیقی سوالات	۲
v۔ نظری دائرہ کار	۲
vi۔ تحقیقی طریقہ کار	۲
vii۔ مجوزہ موضوع پر ماقبل تحقیق	۳
viii۔ تحدید	۳
ix۔ پس منظری مطالعہ	۳
x۔ تحقیق کی اہمیت	۴
ب: ثقافت اور اس کے عناصر	۶
i۔ ثقافت کے مآخذ	۷
ii۔ اردو ناول میں ثقافت کی روایت	۱۳

ج: اختر رضا سلیمی: کوائف اور تصانیف ۱۶
i۔ مختصر کوائف ۱۶
ii۔ تصانیف ۱۸
۔ حوالہ جات ۲۰

باب دوم: " جاگے ہیں خواب میں ": ثقافتی عناصر کا مطالعہ ۲۲
الف: " جاگے ہیں خواب میں " کے ماحول کا مطالعہ: ثقافتی تناظر میں ۲۳
ب: جغرافیائی مآخذ کے ثقافتی عناصر ۲۸
i۔ لباس ۲۸
ii۔ بودوباش ۳۴
iii۔ رسوم وروایات ۴۲
iv۔ علوم وفنون ۴۷
ج: اعتقادی مآخذ کے ثقافتی عناصر ۵۲
i۔ مذہبی رسومات ۵۲
ii۔ توہمات ۶۳
iii۔ اساطیر ۶۷
۔ حوالہ جات ۷۳

باب سوم: " جندر ": ثقافتی عناصر کا مطالعہ ۷۷
الف: " جندر " کے اور ماحول کا مطالعہ: ثقافتی تناظر میں ۷۷
ب: جغرافیائی مآخذ کے ثقافتی عناصر ۸۷
i۔ لباس ۸۷
ii۔ بودوباش ۹۱
iii۔ رسوم وروایات ۹۶
iv۔ علوم وفنون ۱۰۲

ج: اعتقادی مآخذ کے ثقافتی عناصر ۱۰۶
i۔ مذہبی رسومات ۱۰۶
ii۔ توہمات ۱۱۵
iii۔ اساطیر ۱۱۹
۔ حوالہ جات ۱۲۳

باب چہارم: مجموعی جائزہ اور سفارشات ۱۲۸
الف: اختر رضا سلیمی کے ناولوں میں ثقافتی عناصر، مجموعی جائزہ ۱۲۸
ب: نتائج ۱۳۵
ج: سفارشات ۱۳۶
۔ کتابیات ۱۳۷

Abstract

Title:
Study of Culture elements in novel of Akhtar Raza Saleemi (with reference to “Jagay Hein Khawab Main” and “Junder”)
Abstract:

The traditions and culture of society has been reflected in novels since ages. We come to know about mores and customs of specific region and era through novels. Akhtar Raza Saleemi has beautifully portrayed the norms, conventions and culture of “Hazara” in his famous novels “Junder” and “Jagay Hain Khawab Main”

My thesis is is Consit of four chapters. The first chapter of the research work focused on basic/ specific information about the topic. The chapter is further divided into two parts. The first part through light on culture and its aspects, origin of culture and depiction of culture in Urdu novel. Whereas the second part highlights the brief introduction of the writer and his works.

In the second chapter of the thesis, cultural elements in Akhtar Raza’s novel “Jagay Hain Khawab Main” are discussed. The chapter is further divided into two sections characters and environment is studied in the first section whereas cultural elements and its geograpghical origin are narrated in the second section.

In the third chapter environment and characters of the novel “Junder” by Akhtar Raza Saleemi are discussed with respect to the cultural aspect. The origin of convention and tradition narrated in the first segment while clothing norms and customs, lifestyle, erudition, elucidated, religious faiths and beliefs are discussed in second section.

In the fourth chapter, comparative study, general doservation, results and suggestions are explained.

اظہارِ تشکر

میں سب سے پہلے شکریہ اس کریم ذات کا ادا کرنا چاہتی ہوں جس نے ہمیشہ اپنی رحمت کا سایہ مجھ پر کیے رکھا اور اس کی رحمتوں اور کرم کے سبب میں اپنا مقالہ پایہ تکمیل تک پہنچا پائی ہوں۔ یہ بات میں وثوق سے کہہ سکتی ہوں کہ بلاشبہ یہ ایک مشکل مرحلہ ہے جس سے ہر اسکالر کو گزرنا پڑتا ہے۔ مجھے بھی کئی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ متعدد دفعہ میں نے اپنے احباب کو زحمت بھی دی۔ موضوع سے متعلق مواد اور کتابوں کی تلاش کے حوالے سے میں نے اپنے دوستوں اور اساتذہ سے رہنمائی حاصل کی مگر کسی بھی موڑ پر کسی دوست نے مایوس نہیں کیا۔ مَیں بالترتیب ان تمام ہستیوں کا شکریہ ادا کروں گی۔ اساتذہ میں سب سے پہلے میں اپنے محترم نگران مقالہ ڈاکٹر عابد حسین سیال کا شکریہ ادا کرنا چاہتی ہوں جنھوں نے موثر انداز سے میری رہنمائی فرمائی اور قدم قدم پر میری حوصلہ افزائی فرمائی۔ میرے مقالہ میں اگر کچھ خوبیاں ہیں تو ڈاکٹر صاحب کی رہنمائی کے ہی سبب ہیں اور ساتھ ہی ساتھ انھوں نے مجھے اپنی ذاتی لائبریریوں سے مستفید ہونے کا موقع دیا۔ میرا کام شاید اتنی جلدی کبھی نہ ہوتا اگر میرے نگران مقالہ مجھ سے بارہا ایک ہی سوال نہ کرتے کہ "کام کہاں تک پہنچا"؟

اس کے علاوہ میں اپنے اساتذہ کرام ڈاکٹر ذوالفقار علی احسن صاحب اور باقر وسیم صاحب کی بہت ممنون ہوں جنھوں نے مواد کے حصول کے حوالے سے میری مدد کی اور مجھے بارہا کام کرنے کا کہا۔ میں اپنی صدر شعبہ اردو پروفیسر ڈاکٹر روبینہ شہناز صاحبہ اور اپنے تمام اساتذہ ڈاکٹر نعیم مظہر، ڈاکٹر رخشندہ مراد، ڈاکٹر عنبرین شاکر، ڈاکٹر نازیہ یونس، ڈاکٹر صائمہ نذیر، ڈاکٹر ارشاد بیگم اور ڈاکٹر محمود الحسن صاحب کی بے حد ممنون ہوں جن کی محنتوں اور حوصلہ افزائی کی وجہ سے میں آج اس مقام پر پہنچی۔ اس کے علاوہ میں اپنے تمام رفیق ہم جماعت سینئر اور جونیئر کی بے حد ممنون ہوں جنھوں نے وقتاً فوقتاً مجھے مواد فراہم کیا اور میری مدد کی۔

میں اپنی بہت ہی محترم دوست میڈم نصرت صاحبہ کی بے حد ممنون ہوں جنھوں نے ہمیشہ میرے ساتھ تعاون کیا اور اس کے علاوہ میں اپنے تمام اساتذہ کی بے حد ممنون ہوں جنھوں نے مجھے انگلی پکڑ کر چلنا

سکھایا اور مجھے اس قابل بنایا۔ افرادِ خانہ میں اپنے عزیز اور محترم والدین کی انتہائی ممنون ہوں جن کی دعاؤں اور شفقتوں نے مجھے اس منزل تک پہنچایا اور مجھے ہر طرح کی سہولیات فراہم کیں۔ بالخصوص اپنی والدہ ماجدہ کی تہہ دل سے احسان مند ہوں جنھوں نے ہمیشہ میرے لیے دعائیں کیں اور میری ہمت بڑھائی اور مجھ پر اس قدر اعتماد کیا اور گھر میں مجھے ایسا ساز گار ماحول فراہم کیا۔ ہمشیرہ زہرا اور اپنے سب بہن بھائیوں کی شکر گزار ہوں جنھوں نے میرے لیے ہمیشہ دعائیں کی۔ سب کے تعاون کا شکریہ!

رمشہ کنول

باب اول:

تعارف اور بنیادی مباحث

الف: تمہید

i. موضوع کا تعارف

۱۶ جون ۱۹۷۴ء کو ضلع ہری پور کے ایک گاؤں میں پیدا ہونے والے محمد پرویز اختر کو ادبی دنیا اب اختر رضا سلیمی کے نام کے شاعر، ناول نگار، نقاد اور مدیر کی حیثیت سے جانتی ہے۔ ۱۹۹۱ء میں روزنامہ "جنگ" سے انھوں نے بچوں کے لیے کہانی لکھنے سے آغاز کیا اور بعد ازاں سماجی، سیاسی، مذہبی اور ادبی موضوعات پر کئی مضامین اور کالم لکھے۔ ان کے دو ناول "جاگے ہیں خواب میں" (۲۰۱۵ء) اور "جندر" (۲۰۱۷ء) شائع ہو چکے ہیں جبکہ تیسرا ناول زیر تکمیل ہے۔ ۱۹۹۶ء میں شاعری کا آغاز کیا اور غزل اور نظم کے چار مجموعے "اختراع" (۲۰۰۳ء)، "ارتقاع" (۲۰۰۸ء)، "خوشبو مرے ساتھ چل پڑی" (۲۰۰۹ء) اور "خواب دان" (۲۰۱۳ء) شامل ہیں۔ خاص طور پر ناول نگاری میں ان کے کام نے ادبی حلقوں سے بہت پذیرائی حاصل کی ہے۔ ان کے ناولوں کا ایک امتیاز ان کا خاص منظر نامہ ہے جس میں ثقافتی رنگ نمایاں ہیں۔ مجوزہ تحقیق اسی تناظر میں ان کے ناولوں کے تجزیے پر مشتمل ہے۔

ii. بیان مسئلہ

اختر رضا سلیمی نے اپنے ناولوں میں جس علاقے کی کہانیاں بیان کی ہیں وہ اپنے مناظر اور ثقافتی ماحول کے اعتبار سے نیا ہے اور اردو ناول میں اس سے قبل اس علاقے کی بود و باش اور طرزِ زندگی کو اس طرح سے پیش نہیں کیا گیا تھا جس انداز سے اختر رضا سلیمی نے کیا اس مقالے میں اسی نقطہ نظر سے دیکھا گیا ہے۔ سوال یہ تھا کہ اس پیش کش کے محرکات و مضمرات کیا ہیں۔

iii. مقاصد تحقیق

زیرِ نظر تحقیق میں درج ذیل مقاصد پیشِ نظر رہے:

- ثقافت کے عناصر کو زیر بحث لاتے ہوئے ناول میں ثقافت کی کار فرمائی کا مطالعہ کرنا
- زیر تحقیق دو ناولوں میں ثقافتی عناصر کی تلاش و جستجو کرنا اور مصنف کے فکر و فن سے ان کا معنوی ربط تلاش کرنا
- دونوں ناولوں میں موجود ثقافتی عناصر کی پیش کش کے محرکات اور مضمرات کا جائزہ لینا

iv. تحقیقی سوالات

- ثقافت کے عناصر اور ان کے ماخذات کیا ہوتے ہیں؟
- زیر تحقیق ناولوں میں ثقافت کے عناصر کی کار فرمائی کی نوعیت کیا ہے؟
- زیر تحقیق ناولوں میں ثقافتی عناصر کی پیش کش کے محرکات و مضمرات کیا ہیں؟

v. نظری دائرہ کار

ناول ایسی صنفِ ادب ہے جس میں زندگی کی عکاسی مقابلتاً زیادہ جامع اور مفصل طور پر کرنے کی گنجائش موجود ہے۔ کسی عہد کے تاریخی و سماجی حالات، انسانی رویوں اور تہذیبی و ثقافتی عناصر کی پیش کش ناول میں زیادہ بہتر طور پر پیش کی جاسکتی ہے۔ ناول میں کرداروں کی بود و باش اور طرزِ معاشرت کے بیان میں کسی علاقے کی ثقافت کے رنگ جھلکتے ہیں جس کے ماخذات جغرافیائی بھی ہوتے ہیں اور فکری بھی۔ زیر تحقیق موضوع اسی تناظر میں اختر رضا سلیمی کے دو ناولوں کے مطالعے پر مبنی ہے۔

vi. تحقیقی طریقہ کار

تحقیق کا موضوع اختر رضا سلیمی کے ناولوں کا ثقافتی مطالعہ ہے لہٰذا موضوع سے متعلق مطبوعات کی جمع آوری، ترتیب اور مطالعہ و تجزیہ کیا گیا۔ اس میں تاریخی تحقیق اور دستاویزی تحقیق زیادہ معاون طریقہ کار

تھا۔ علاوہ ازیں ضرورت کے پیش نظر مزید کسی تحقیقی طریقہ کو اختیار نہیں کیا گیا۔ بنیادی ماخذات میں اختر رضا سلیمی کی کتابیں جبکہ ثانوی ماخذات میں اختر رضا سلیمی اور ان کے فکر و فن سے متعلق چھپنے والے مضامین، کتب اور رسائل کا مطالعہ کیا گیا جن تک رسائی کے لیے لائبریریوں سے رجوع کرنے کے علاوہ انٹرنیٹ اور دیگر ماخذات سے بھی حسب ضرورت استفادہ کیا گیا۔

vii. مجوزہ موضوع پر ماقبل تحقیق

اختر رضا سلیمی کی شاعری، ناول نگاری اور مجموعی ادبی خدمات پر کئی مقالے لکھے جا چکے ہیں۔ ان میں پروین اختر کا مقالہ "اختر رضا سلیمی کی شاعری" (ایم اے، نمل، اسلام آباد، ۲۰۰۹ء)، رفیعہ سلیم کا مقالہ "اختر رضا سلیمی کا ناول 'جاگے ہیں خواب میں' ایک تجزیاتی مطالعہ" (ایم اے، ایجوکیشن یونیورسٹی، فیصل آباد، ۲۰۱۶ء)، محمد فاروق کا مقالہ "اختر رضا سلیمی کی ادبی خدمات" (ایم۔فل، منہاج یونیورسٹی، لاہور، ۲۰۱۷ء)، محمد سلیمان کا مقالہ "'جاگے ہیں خواب میں' از اختر رضا سلیمی، تنقیدی جائزہ" (بی ایس، زکریا یونیورسٹی، ملتان، ۲۰۱۸ء) اور ایک مقالہ "'جاگے ہیں خواب میں'، تاریخی اور تہذیبی مطالعہ" (ایم۔فل، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد، جاری) شامل ہیں۔ اس کے علاوہ ان کے ناولوں پر اسد محمد خان، ڈاکٹر اقبال آفاقی، محمد حمید شاہد، مستنصر حسین تارڑ اور محمود شام جیسے اکابرین نے اپنے مضامین میں اظہارِ خیال کیا ہے۔

viii. تحدید

مجوزہ مقالے میں تحقیقی اور تنقیدی حوالے سے مطالعے کا دائرہ اختر رضا سلیمی کے ۲۰۱۷ء تک کے شائع شدہ ناولوں میں ثقافتی عناصر کی کارفرمائی تک رکھا گیا۔ اختر رضا سلیمی کا زیر تکمیل ناول اور ان کی ناول نگاری کی دیگر جہات اس مقالے کی حدود سے باہر رکھا گیا۔

ix. پس منظری مطالعہ

اردو ناول میں آغاز سے لے کر عہدِ حاضر تک مختلف علاقوں، خطوں، شہروں اور دیہات کی ثقافت پیش کی جاتی رہی ہے جس کا تجزیہ ناولوں کے تنقیدی مطالعات میں ہوتا رہا ہے۔ اس کے علاوہ اردو ناول میں

مسلم ثقافت کے حوالے سے بھی ڈاکٹر فاروق عثمان کا کام موجود ہے۔ اردو ناول میں دیہات نگاری کے حوالے سے بھی کام ہوا ہے جو اگرچہ پنجاب اور سندھ کے دیہات کے حوالے سے ہے تاہم اس کا مطالعہ مجوزہ تحقیق کے لیے بھی مفید ثابت ہوا۔

x. تحقیق کی اہمیت

اردو ناولوں میں اسالیب سے لے کر موضوعات تک ایک تنوع پایا جاتا ہے اور اسی طرح ایک بڑی تعداد میں اردو ناول پر تنقید موجود ہے۔ لیکن جدید اردو ناول اور خاص طور پر اکیسویں صدی کی ابتدا میں ادبی افق پر نمودار ہونے والے ناولوں کے ثقافتی عناصر پر بحث نہ ہونے کے برابر ہے۔ جدید ناول نہ صرف اپنی پیش کش میں نیا ہے بلکہ اپنے موضوعات اور اسالیب میں جدید مسائل اور جدید مناہج کو سموئے ہوئے ہے۔ اس حوالے سے جدید لسانی و تنقیدی مباحث کو سامنے رکھتے ہوئے کام کرنے کی ضرورت اس لیے بھی ہے کہ اکیسویں صدی کی ابتدا میں لکھے جانے والے ناولوں کے مسائل اور تعین قدر اس سے ماقبل ناولوں سے مختلف ہے، خاص طور پر وہ ناول جن میں جدید سائنسی، فلسفیانہ اور لسانی بحثوں سے استفادہ کرتے ہوئے ناول نگار نے سماجی، معاشی اور ادبی جہات کی توسیع کی ہے۔ زیرِ نظر تحقیق میں "جاگے ہیں خواب میں" اور "جندر" کا مطالعہ ثقافتی تناظر میں کرنے سے ناولوں کے ثقافتی مطالعات کی طرف پیش رفت ہوئی۔

ب: ثقافت اور اس کے عناصر

جس چیز کو ہم اکثر اوقات دیکھتے رہتے ہیں اور یہی نہیں بلکہ اس کی قدر بھی نہیں کرتے اور اسے کبھی نہیں دیکھتے انہیں چیزوں میں سے ایک نام ثقافت کا ہے۔ ہم اپنی زندگی میں دن، رات، صبح و شام بیسوں مرتبہ اپنے رویوں، عادات، رہن سہن میں اپنی تہذیب و ثقافت کا اعادہ کرتے ہیں لیکن ہم زیادہ تر ایسا لاشعوری طور پر ہی کرتے ہیں۔ ہماری عادات، اٹھنا بیٹھنا، اندازِ گفتگو، نشت و برخاست اور ہماری تمام اخلاقی اقدار غرض ہر چیز میں ثقافت کا ہی گہرا عمل دخل ہے۔ الغرض قائد اعظم محمد علی جناح نے بھی مسلمانوں کو ایک الگ قوم کا نظریہ اسی غرض سے دیا اور یہ دلیل پیش کی تھی کہ مسلمان مذہب کے علاوہ ثقافتی اعتبار سے بھی ہندوؤں

سے الگ قوم ہیں انہوں نے ہندو ثقافت اور مسلم ثقافت کو الگ الگ حقیقتوں کے طور پر پیش کیا ہے۔ اسی وجہ سے قائداعظم نے ایک موقع پر فرمایا:

"اسلام کے قومی تصور اور ہندو دھرم کے سماجی طور طریقوں کے باہمی اختلاف کو محض وہم و گمان بنانا ہندوستان کی تاریخ کو جھٹلانا ہے۔ ایک ہزار سال سے ہندوؤں کو تہذیب اور مسلمانوں کی تہذیب ایک دوسرے سے دو چار ہیں۔ یہ دونوں قومیں آپس میں میل جول رکھتی چلی آئی ہیں کہ ان کے اختلافات اسی شدت سے موجود ہیں۔"(۱)

تہذیب و ثقافت میں معمولات زندگی میں روایتی معیارات کی پابندی اور رسوم و روایات کی پاس داری کی جاتی ہے۔ تہذیب و ثقافت میں عقائد و نظریات، فنون و ہنر اور رسم و رواج اور اعمال و اطوار وغیرہ شامل ہیں۔ مسلمانوں اور ہندوؤں نے علیحدہ ہونے کا فیصلہ بھی مذہب کے علاوہ ثقافتی ورثے کو مدِ نظر رکھ کے کیا تھا۔ ثقافت در حقیقت میں عربی زبان سے اخذ کیا گیا ہے جس کا مادہ ثقف ہے دوسرا لفظ جو ثقافت کا ہم معنی خیال کیا جاتا ہے تہذیب ہے۔ ثقافت کی تعریف جمیل جالبی نے اپنی کتاب پاکستانی کلچر میں یوں کی ہے:

"ثقافت" بھی عربی زبان کا لفظ ہے اور اس کا مادہ "ثقف" ہے۔ "لسان العرب" میں ثقافت کے معنی یہ بتائے گئے ہیں کہ علوم و فنون و ادبیات پر قدرت و مہارت کسی چیز کو تیزی سے سمجھ لینا اور اس میں مہارت کرنا، سیدھا کرنا۔"(۲)

ثقافت کا مفہوم کسی بھی فن میں ماہر ہونا اور اس کے طریقے اور عمل کو اچھی طرح جاننا ہے۔ اس کا اظہار ثقافت کہلاتا ہے۔ جمیل جالبی نے ثقافت کے بارے میں یہی مفہوم دیا ہے کہ کسی چیز کو سمجھ کر اس میں مہارت حاصل کرنا اور اس کو درست انداز میں بیان کرنا ثقافت کہلاتا ہے۔ نظیر صدیقی نے ثقافت کی تعریف یوں کی ہے:

"ثقافت" سے مراد پورا طریقہ زندگی ہے یعنی ثقافت اس کل کا نام ہے جس میں مذہب اور عقائد، علوم اور اخلاقیات، معاملات اور معاشرت، فنون و ہنر اور رسوم و رواج سبھی

شامل ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں سمجھیئے کہ ثقافت کسی قوم کے ان تمام اصول و اقدار، عقائد و ضوابط اور اعمال و اطوار کے مجموعے کا نام ہے جس سے کسی قوم کی امتیازی خصوصیات عبارت ہوتی ہیں۔" (۳)

ثقافت نے تمام انسانی زندگی کے ہونے والے معاملات زندگی کو اپنے حصار میں لیا ہوا ہے خواہ وہ انسان کی ذاتی زندگی ہو یا معاشرتی زندگی ہمیں ثقافت کے مظاہر ہی ہر جگہ نظر آتے ہیں۔ ثقافت میں مذہبی اور اعتقادی مآخذ کو بھی بیان کیا جاتا ہے۔ یہ کسی خطے کے لوگوں کے رسم و رواج، علوم و فنون، معاملات، معاشرت اور اصول و ضوابط کا بہتر اندازہ کر سکتی ہے اور یہ تمام ثقافتی عناصر ہیں۔ انگریز مصنفین نے بھی ثقافت کی تعریف اپنے الفاظ میں بیان کی ہے اورای، بی ٹیلر نے بھی اپنی کتاب "Primitive Culture" میں لکھا ہے "ثقافت، علوم و فنون، عقادورسوم، اخلاقیات، قوانین، عادات و اطوار سے مملو وہ اسلوبِ حیات جس کا اکتساب انسان معاشرے کے فرد کی حیثیت سے کرتا ہے۔"(۴)

انگریزی مصنفین نے ثقافت کو معاشرتی رہن سہن، علوم و فنون، عادات و اطوار، رسوم و روایات، مذہبی رسومات، اساطیری اور توہمات پرستی کا ملغوبا قرار دیا ہے اسی طرح Clyde Kluckhotn نے اپنے مضمون "Concept of Culture" میں ثقافت کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے ثقافت کی تعریف بیان کی ہے۔ "یہ وہ نظام ہے جو ایک گروپ کے لوگوں میں نظام اقدار کی شکل میں مشترک طور پر موجود ہوتا ہے۔"(۵)

ثقافت ایک ایسا نظام ہے جو تمام اقدار خواہ اعتقادی ہو یا جغرافیائی دونوں کو بیان کرتا ہے اور تمام لوگ ان اقدار کو قبول کرتے ہیں اور یہ ہر خطے یا علاقے میں موجود ہوتا ہے۔ فلپ بیگ بائی نے اپنے طویل مضمون میں اس موضوع پر بحث کرتے ہوئے ثقافت کی تعریف یوں بیان کی ہے:

"ثقافت کسی اجتماع کے بیشتر افراد کے ان متواتر رویوں کا نام ہے جو اصل کے اعتبار سے نسل اور جبلی نہیں ہوتے بلکہ کسی اجتماع نے خاص ماحول میں مخصوص عقائد و افکار اور دوسرے اثرات کے تحت اپنے اندر پیدا کر لیے ہوتے ہیں اور ان میں ایک رنگی پائی جاتی ہے۔"(۶)

ثقافت در اصل خاص ماحول اور معاشرے کی پیداوار ہے کوئی انسان نسلی یا جبلی طور پر اسے حاصل نہیں کر سکتا بلکہ یہ ماحول سے ہی سیکھی جاتی ہے یہ بظاہر نظر نہیں آتی، لیکن ہم اس کو من و عن قبول کرتے ہیں۔ یہ ہمارے ماحول اور ماحول میں موجود کرداروں کے ذریعے نظر آتی ہے۔ یہ کرداروں کی وضع و قطع، رہن سہن سے بھی عیاں ہوتی ہے۔ڈاکٹر فلپ بگ بی کی کہی ہوئی بات کے پیشِ نظر ڈاکٹر ایس ایم یوسف نے اپنے مضمون "Same aspect of Islamic Culture" میں لکھا ہے:

> "ترجمہ: ثقافت اساسی طور پر ایک ذہنی رویہ ہے نفس و آفاق کے بارے میں یہ انسان کی اپنی ایک سوچ کا نام ہے۔ خوشیوں اور دکھوں کے بارے میں ایک مخصوص تصور کی شکل ہے یہ اس کی اپنی خوش بختی یا بد بختی کے بارے میں رد عمل ہے اور روزمرہ کے پیش آنے والے واقعات کے درمیان ایک سلیقہ مندی سے گزر کرنے کا کام ہے۔ رویوں کی یہ ساری انسانی جہتیں بعض بنیادی اقدار کے شعور سے پھوٹتی ہیں۔"(۷)

ثقافت در حقیقت میں ثانوی ماحول کی حیثیت رکھتا ہے مگر یہ بنیادی ضروریات کو کم ہی مد نظر رکھتی ہے اس میں بنیادی ضروریات کی تسکین سے بڑھ کر ذوقی اور تخلیقی مظاہر زیادہ حاوی نظر آتے ہیں اسی صورت میں ایک ثقافت دوسری ثقافت سے مختلف ہو سکتی ہے اور دیکھنے والا دونوں ثقافتوں میں تمیز کر سکتا ہے۔

i. ثقافت کے مآخذ

ثقافت کے مظاہر کو بنیادی طور پر دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے مادی اور غیر مادی۔ مادی سے مراد گھریلو سامان روزمرہ استعمال ہونے والی اشیاء مشینری، علوم و فنون جبکہ غیر مادی میں رسم و رواج، میل جول کے طریقے، روایات، ادب معاشرت وغیرہ شامل ہیں۔ دونوں ہی ترقی یافتہ ثقافت کے لیے بنیادی جزو ہیں۔ سید امجد علی نے اپنے مضمون میں ثقافت کی وضاحت اس انداز میں کی ہے:

> "کسی ملک کی ثقافت جاننا، حقیقتاً اس کے عوام کو جاننا ہوتا ہے جس وقت ہم ان لوگوں کو اپنے روزمرہ کاموں میں مصروف دیکھتے ہیں تو وہ ہمارے لئے ناموں کے علاوہ اور کوئی

حیثیت نہیں رکھتے، مگر وہ جب کسی لمحے ہنستے، روتے، خوش یا ناراض ہوتے نظر آتے
ہیں تو ہمیں اسی لمحے ان کی روح کی ایک جھلک حاصل ہو جاتی ہے۔"(۸)

کسی بھی خطے کا ثقافتی ورثہ عوام کی طرزِ زندگی پر ہی مشتمل ہوتا ہے جو انہوں نے کئی صدیوں کے گزرنے کے بعد سیکھا ہوتا ہے اور وہ عمل کئی صدیوں کے گزرنے کے ساتھ ساتھ اپنی زندگیوں کا حصہ بنایا ہوتا ہے اس میں کھانے پینے، پہننے اوڑھنے سے لے کر تمام اخلاقی معیارات اور انداز تعمیر بھی شامل ہے۔ معاشرے میں موجود ہر شے ثقافت کی ہی نمائندگی کرتی ہے اور ثقافت میں یہ تمام لوازمات شامل ہیں۔

ڈاکٹر عبدالسلام خورشید نے اپنے مضمون "پاکستانی ثقافت" میں ثقافت کے تین مآخذ بیان کیے ہیں:

"ثقافت تین چیزوں سے عبارت ہے۔ مذہب، تاریخ اور جغرافیہ یہ تین چیزیں اسے نمو بخشتی ہیں اول دماغ اور دھرتی۔ دل ماحول کی اشیاء اور تصورات کو محسوس کرتا ہے۔ دماغ سوچتا ہے۔ اشیاء اور تصورات کی تراش خراش، آراستگی و پیراستگی اور نوک پلک سنوارنے میں مسلسل مصروف رہتا ہے اور دھرتی دلوں اور دماغوں، محسوسات اور سوچ کے تبادلے، امتزاج اور انہیں نت نئے روپ دینے کا ایک بہت بڑا ذریعہ ہے۔ جب سے انسانی معاشرے میں بستی، قبیلے یا دیس کے روپ میں منظم زندگی کا آغاز ہوا ہے، ثقافت کی بنیاد مذہب ہی رہا ہے۔ کسی زمانے میں مذہب جادوگری اور اوہام کا دوسرا نام تھا۔ پھر آگ کی پرستش اور بتوں کی پوجا کا نام بنا اور اس کے بعد توحید کے تصور نے مذاہب کو نیا رنگ دیا۔ اس دوران میں سوچنے سمجھنے اور رہن سہن کے سارے پہلو مذہب کے تابع نہیں تھے تو کم از کم اس سے متاثر ضرور تھے۔ روحانی اور جذباتی زندگی کے پہلو بہ پہلو معاشی زندگی کو بڑی اہمیت حاصل ہے اور اس میں جغرافیہ کارفرما ہوتا ہے۔ سنگ لاخ چٹانوں میں بسنے والے انسانوں کی زندگی مختلف ہوتی ہے اور ریگستانوں میں آباد انسانوں کی مختلف، سبزہ زار پہاڑی علاقوں میں زندگی کا ایک روپ پایا جاتا ہے اور میدانی علاقوں میں دوسرا۔ دریاؤں اور سمندر کے کنارے آباد لوگوں کی زندگی ایک مخصوص سانچے میں ڈھل جاتی ہے اور بے آب و گیاہ علاقوں میں زندگی کے طور طریقے بالکل مختلف ہوتے ہیں پھر دیہات میں زندگی کا رنگ ڈھنگ ایک ہوتا ہے اور شہروں میں دوسرا کہ وہاں مختلف طور طریقوں کے امتزاج اور انسانوں کے میل جول سے زندگی ایک نیا روپ لے لیتی ہے۔ مذہب اور معاش مختلف مراحل سے گزرتے ہیں۔ انہی سے تاریخ کی ابتداء ہوئی ہے زبانیں زیادہ بھی ہو

سکتی ہیں اور زبان ایک ہو تو بنیادی ڈھانچہ ایک ہی رہتا لیکن مختلف علاقوں میں اس کے انداز مختلف ہوتے ہیں۔ زبانوں کی کوکھ سے ادب جنم لیتا ہے۔ پہلے لوک کہانیاں، پھر لوک رومان، پھر لوک گیت اور اس کے بعد تحریری ادب۔ انسانوں کے میل جول سے اخلاقی قدریں ترتیب پاتی ہیں۔ روایات جنم لیتی ہیں۔ محبت کے بارے میں، شجاعت کے بارے میں، مہمان نوازی کے بارے میں، مذہب، معاش، جغرافیہ، ادب، تفریحات، اخلاقی اقدار اور روایات ان بندھنوں کا کام دیتے ہیں جن سے ایک خطے کے اندر رہنے والے قبائل اور شعوب ایک قوم کا روپ دھار لیتے ہیں۔ یہیں سے قومی تشخص جنم لیتا ہے۔ یہیں سے اس کی حفاظت کے لیے اتحاد و استحکام کے سوتے پھوٹتے ہیں اور ثقافتی شناخت اہم عنصر بن جاتی ہیں۔"(۹)

ثقافت کو تین بنیادی حصوں میں تقسیم کیا گیا جس میں تاریخ، مذہب اور جغرافیہ اہم مآخذ ہیں۔ تاریخ میں ماضی، حال اور مستقبل مذہب میں مذہبی رسومات، اساطیری، قصہ گوئی اور جغرافیہ میں رہن سہن، بود و باش، اوڑھنا بچھونا، علوم و فنون اور دستکاریاں وغیرہ شامل ہیں۔ عبدالسلام خورشید نے بھی اپنے مضمون میں اس کی وضاحت کرتے ہوئے اس میں زبان، اخلاقی اقدار، مذہب، معاش، جغرافیہ، ادب اور روایات وغیرہ کو ہی ثقافت کا نام دیا ہے۔ انسانی طرز زندگی میں لوگوں کا اخلاق، فکر و فلسفہ، علوم و فنون، اصولِ معیشت و سیاست، شعر و نغمہ، زبان و ادب، رسوم و روایات بھی شامل ہیں اور یوں یہ معاشرتی پہلو تہذیب و ثقافت کے نام سے جانے جاتے ہیں۔ اکثر ادبا نے تہذیب اور ثقافت کے لیے کلچر کی اصلاح استعمال کی ہے اور اسے دو حصوں مادی اور روحانی کا مرکب قرار دیا ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے اپنی کتاب "پاکستانی کلچر" میں تہذیب و ثقافت (کلچر) کے موضوع پر سیر حاصل بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

> "کلچر کے سلسلے میں اب تک ہمارے ہاں دو لفظ استعمال ہو رہے ہیں ان میں سے ایک لفظ تہذیب اور دوسرا ثقافت، تہذب کا لفظ صدیوں سے نہ صرف ہماری زبان بلکہ عربی اور فارسی سے مستعمل ہے جو شائستگی کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے جس میں خوش اخلاق، اطوار، گفتار اور کردار کی شائستگی شامل ہے کہ وہ اطوار و گفتار میں شائستہ ہے۔ لفظ تہذیب ان چیزوں سے تعلق رکھتا ہے جن کا تعلق ہمارے ظاہر سے ہے۔ انسان جس طور پر اپنی معاشرت اور اخلاق کا اظہار کرتا ہے اور وہ اس کی تہذیب ہے۔۔۔۔ وہ تمام چیزیں جن کا تعلق زور خارجی چیزوں اور طرزِ عمل کے اس اظہار پر

ہے جس میں خوش اخلاقی، اطوار، گفتار اور کردار شامل ہیں اور لفظ ثقافت کا زور ذہنی صفات پر ہے۔ تہذیب اور ثقافت کے مجموعے کو کلچر کہیں گے جس میں تہذیب اور ثقافت دونوں کے مفاہیم شامل ہیں اس کے معنی یہ ہوئے کہ کلچر ایک لفظ ہے جو زندگی کی ساری سرگرمیوں کا خواہ وہ ذہنی ہوں یا مادی، خارجی ہوں یا داخلی احاطہ کرلیتا ہے۔"(۱۰)

ثقافت اور تہذیب دونوں ہی عربی زبان کے لفظ ہیں لیکن ثقافت کا مطلب کسی بھی کام کے کرنے میں مہارت اور تہذیب کا مطلب کاٹنا تراشنا اور اصلاح کرنا ہے۔ گویا ثقافت ذہنی اور فکری صلاحیتوں پر محیط ہے جبکہ تہذیب کا تعلق طور طریقے، انداز و اطوار کی پاکیزگی سے منسلک ہے۔ مختلف ادبا نے دونوں کے مفاہیم کو یکجا کرکے ایک لفظ "کلچر" کے ذریعے اس کی تعریف بیان کی ہے۔ اسی طرح ڈاکٹر نصیر احمد ناصر کلچر کی اصطلاح کے حوالے سے لکھا ہے:

"کلچر بھی ایک ایسی ہی اصطلاح ہے جس کی اہل علم و دانش نے مختلف قسم کی بیسویں تعریفیں کی ہیں کلچر کے لیے عربی اور اردو میں "ثقافت" کی اصطلاح عصر حاضر کی پیداوار ہے۔"(۱۱)

لفظ ثقافت کے لیے بیسویں صدی کے زیادہ تر ادبا نے کلچر کا لفظ استعمال کیا ہے اور کلچر کی وضاحت کرتے ہوئے انھوں نے وہی بنیادی عناصر وضاحت کے ساتھ بیان کیے ہیں جو کہ ثقافت کا خاصہ ہیں اور کلچر میں انسان کی ظاہری بود و باش اور مادی و ذہنی ترقی وغیرہ شامل ہیں اس میں بھی تمام خوشی و غمی کی رسومات کے ساتھ ساتھ ادبی محفلیں، عبادت کے طور طریقے اور ظاہری وضع قطع شامل ہیں۔ کلک یاں کیلی نے کلچر کی تعریف یوں کی ہے:

"یہ رہن سہن کا ایسا طریقہ ہوتا ہے جو انسانوں کے ایک گروہ، قبیلے یا علاقے میں رائج ہوتا ہے۔ اس کی ایک تاریخ ہوتی ہے اور جغرافیائی ماحول ان طریقوں کے وضع کرنے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ اس میں ثقافتی گروہ کی زبان، ادب، رسم و رواج، عبارت

کے طریقے، مذہبیت، ٹوٹم، ٹیبو، اخلاقیات، شادی بیاہ کے طریقے اور رسمیں، ناچ، گانے، شعر وشاعری، ادبی محفلیں، غرض سب ہی عناصر شامل ہوتے ہیں۔ ان سب کا مقصد گروہ کے اندر ایک دوسرے سے رشتے اور انسلاک قائم رکھنا اور ایک دوسرے کی بات سمجھنا ہوتا ہے۔"(۱۲)

فیض احمد فیض نے اپنے مضمون تہذیب کے اجزائے ترکیبی میں ثقافت کے لیے کلچر کی اصطلاح استعمال کی ہے اور ثقافت کے تین بنیادی مآخذ بتائے ہیں، لکھتے ہیں:

"ہر قوم کی تہذیب یا کلچر کے تین پہلو ہوتے ہیں ایک اس قوم کے اقدار اور احساسات اور عقائد جن میں وہ یقین رکھتی ہے۔ دوسرے اس کے رہن سہن کے طریقے اس کے آداب اور اس کے اخلاق ظاہری اور تیسرے اس کے فنون، یہ تینوں ایک دوسرے سے منسلک ہوتے ہیں جنہیں ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا اور ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتے رہتے ہیں۔"(۱۳)

ڈاکٹر عثمان فاروق نے بھی اپنی کتاب "اردو ناول میں مسلم ثقافت" میں ثقافت کے بنیادی تین عوامل بتائے ہیں، وہ لکھتے ہیں: "معاشرہ، افکار اور مظاہر ثقافت یہ تینوں عوامل مل کر معاشرے کے کینوس پر "ثقافت" نام کے جس نقش کی تخلیق کرتے ہیں وہ یقیناً بڑا متنوع ہوتا ہے۔"(۱۴)

ثقافت میں انسانی گروہ اور قبیلوں کے طریقہ کار ہیں جس میں حال، ماضی، مستقبل، زبان و ادب، معاشرتی واخلاقتی اقدار،، شادی بیاہ کی رسومات بچوں کے حوالے سے مذہبی اور معاشرتی رسومات، ڈھول گانے وغیرہ شامل ہیں۔ زیادہ تر ادبانے ثقافت کے بنیادی تین مآخذ ہی بیان کیے ہیں اور اسی کے حوالے سے تفاصیل بھی بیان کی ہے۔ جمیل جالبی، فیض احمد فیض اور ڈاکٹر عثمان فاروق الغرض تمام ادبانے ثقافت کے مختلف مآخذات بیان کیے ہیں اور ثقافت کی وضاحت کرتے ہوئے تمام معاشرتی عوامل کو سمیٹا ہے۔ ڈاکٹر عبدالسلام خورشید نے تاریخ، مذہب، جغرافیہ اور فیض احمد فیض نے اس میں علوم و فنون کا اضافہ کیا ہے۔ مختصراً اعتقاد مآخذ جس میں مذہبی رسومات، قصہ گوئی، اساطیر اور توہمات اور جغرافیائی مآخذ میں بود وباش، رہن

سہن، لباس، دستکاریاں، علوم و فنون اور معاشرتی اخلاقی رسوم و روایات وغیرہ شامل ہیں۔ الغرض لفظ ثقافت اور اس کے تمام تر مترادفات کو مد نظر رکھتے ہوئے اس کا اصطلاحی مفہوم جو نظر آتا ہے وہ ایسے نظریات پر مشتمل ہے جس سے انسان کی معاشی و سماجی زندگی اخلاقی و روحانی لحاظ سے تہذیب و شائستگی اور اصلاح سے ہمکنار دیکھائی دیتی ہے۔ منشی عبدالرحمن خان ثقافت کی تعریف بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں:

> "ثقافت پوری انسانی زندگی پر محیط ہے۔ یہ زندگی کی دیکھنا ہے تہذیب، تمدن، معاشرت، معاملات اور طرزِ زندگی کا نام ہے۔ اس میں رہن سہن سب شامل ہے۔ غیر مسلموں کے نزدیک بھی ثقافت راگ و رنگ کا نام نہیں۔ ہندوستان کے یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کے غیر مسلم سیکرٹری مسٹر سموئل متھائی کے قول کے مطابق" ثقافت" محض گانے اور ناچنے کو ہی نہیں کہتے، "ثقافت" زندگی کے سارے کاروبار کا نام ہے۔"(۱۵)

اور اس کے علاوہ ڈاکٹر فرمان فتح پوری ثقافت کا مفہوم واضح کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "متمدن زندگی میں جسے کسی قوم یا ملت کی ثقافت کہا جاتا ہے وہ اس قوم کی علمی، فکری، تخیلی، تخلیقی، تاریخی، اخلاقی، مذہبی اور ذہنی و روحانی ترقیات و فتوحات کا نچوڑ حاصل ہوتا ہے۔"(۱۶)

ثقافت در حقیقت میں رہن سہن یا انسانی طرزِ زندگی ہے جو کسی علاقے یا خطے میں رہنے والے انسانوں کے گروہوں، قبیلوں میں رائج نظر آتی ہے۔ اس میں تاریخ کے ساتھ ساتھ تہذیب و ثقافت نظر آتی ہے۔ جغرافیائی اور مذہبی لحاظ سے وہاں کا ماحول ان کے طرزِ زندگی کو واضح کرنے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ اس میں رسم و روایات، عبادات کے طور طریقے، قصہ گوئی، اخلاقیات، شادی بیاہ وغیرہ کی رسومات، خوشی و غم میں ہونے والی رسومات مثلاً عقیقہ، ختنہ اور چہلم، ناچ گانے کی رسمیں فنون، علم و ادب الغرض تمام عناصر شامل ہیں۔ ان تمام عناصر کا مقصد اصل میں گروہ کے اندر رہنے والے تمام افراد کو ایک دوسرے سے منسلک رکھنا اور تمام ثقافتی سرمایہ دوسری نسلوں تک منتقل کرنا ہے۔

ii. اردو ناول میں ثقافت کی روایت

ناول جو بظاہر پر کیف کرداروں اور خیالات کا مجموعہ ہوتا ہے لیکن باطنی سطح پر وہ انسان کو واضح حقیقت کے پس منظر میں زندگی گزارنے کا ڈھنگ بھی سکھاتی ہے اور انسانی زندگی کی بنیادی حقیقتوں کو بیان کرنے کے ساتھ ساتھ اس کے کرداروں کا واقعات کے پیچھے ایک مربوط فکری خاکہ نظر آتا ہے۔ ناول کے ظاہری پلاٹ، کردار اور واقعات کو پس پشت ڈال کر دیکھا جائے تو فکری خاکہ زیادہ تر تہذیب و ثقافت کا عکاس نظر آتا ہے۔ ناول کی مختلف اقسام جن میں نفسیاتی، روحانی، جاسوسی، معاشرتی، تاریخی یا پھر اصلاحی مقصد، حادثاتی، واقعاتی اور سماجی ناول ہیں۔ سماجی ناول کی تعریف بیان کرتے ہوئے عظیم الشان صدیقی نے اپنی کتاب "اردو ناول آغاز و ارتقاء" میں لکھا ہے:

> "سماجی ناول میں محض کسی گھر خاندان یا کسی طبقہ کی زندگی کو پیش نہیں کیا جاتا ہے بلکہ اس میں سماج کے مختلف شعبہ ہائے زندگی مذاہب، عقائد، شادی بیاہ کی تقریبات، رسومات معاشی مسائل طبقاتی امتیازات نظریاتی اختلافات، تفریحی مشاغل، سماجی برائیاں اور خوبیاں بیان کی جاتی ہیں اس قسم کے ناول کو محدود عصری یا معاشرتی ناول بھی کہہ سکتے ہیں۔"(۱۷)

ناول میں ثقافتی عناصر کے رجحانات کے حوالے سے ڈپٹی نذیر احمد کے خانہ داری ناول، مراۃ العروس، بنات النعش اور توبتہ النصوح شامل ہیں۔ "نصوح اور سلیم کی گفتگو" ناول میں انھیں خواب میں آخرت کے دل دہلا دینے والے مناظر دیکھ کر اپنے خاندان کی آخرت کی فکر ہوئی اور ان کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا لیکن بیٹا کلیم راہ راست پر نہیں آیا اور اپنی اصلاح کرنے کی بجائے گھر چھوڑ کر چلا گیا اور عبرت ناک سزا پائی۔ اپنے ناول کے حوالے سے نذیر احمد نے دعویٰ کیا ہے کہ "اس ناول کا ڈھانچہ اپنے دینی رجحانات اور ثقافتی میلانات کے تحت خود ہی تیار کیا جاتا ہے۔"(۱۸) ناول میں دینی رسومات کا تذکرہ جگہ جگہ نظر آتا ہے ناول کے کرداروں کے ناموں سے ہی یہ بات واضح ہوتی ہے کہ وہ ایک نصیحت کرنے والے ایک سمجھ دار اور عقل سلیم رکھنے والے لوگوں کا

ذکر کر رہا ہے کیونکہ نصیحت وہی قبول کرتا ہے جو عقل رکھتا ہے۔ اسی لیے اس کے کرداروں سے ہی یہ بات سامنے آئی۔ کرداروں کے مکالموں میں تعجبانہ انداز نہیں ہے لیکن وہ عام گفتگو میں بھی ایک اچھے طالب علم کو آدابِ معاشرت سے آگاہ کرتے نظر آتے ہیں۔ آدابِ معاشرت میں سب سے اہم باتیں رسومات و روایات اور اقدار و روایات کا تذکرہ ہے جو کہ ہماری ثقافت کی نمائندگی کرتے ہیں بلکہ ہماری ثقافت کے بنیادی عناصر میں شامل ہیں اسی ناول پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر عثمان فاروق نے اپنی کتاب "اردو ناول میں مسلم ثقافت" میں اس ناول کے حوالے سے لکھا ہے:

> "یہ درست ہے کہ ناول کا موضوع گھر کے اندر اولاد کی تربیت ہے لیکن اصلاح کی غرض سے انہوں نے ثقافتی اور سماجی زندگی کے تمام پہلوؤں پر اس دور کی صورت حال کے اندر رہتے ہوئے پوری توجہ دی ہے۔ یہ ضروری بھی تھا کیونکہ گھر کے اندر ماحول پر توجہ مرکوز کرتے ہوئے ارد گرد کے ماحول سے صرفِ نظر کیسے ہو سکتی ہے کہ جس کے اثرات گھر کے اندر تک در آتے ہیں۔"(۱۹)

نذیر احمد کے ناول "توبتہ النصوح" کے کچھ عرصے بعد رتن ناتھ سرشار نے بھی "فسانہ آزاد" ناول لکھا جو شروع میں "اودھ" اخبار میں قسط وار شائع ہوتا رہا۔ اس ناول میں معاشرتی رہن سہن ہمیں ہر جگہ نظر آتا ہے، اس ناول کے حوالے سے رائے دیتے ڈاکٹر عثمان فاروق نے اپنی کتاب میں لکھا ہے:

> "ایک تہذیب ایک تمدن کی عکاسی اسی کا حقیقی جوہر ہے۔ نذیر احمد نے گھر کے اندر کی دنیا کی عکاسی کی رتن ناتھ سرشار گھر کے ساتھ ساتھ کوچہ و بازار کے چلن کو بھی تحریر میں لے آئے اور یوں ایک مکمل معاشرت کا احاطہ کر لیا۔ گو اس ناول میں کسی بنیادی مسئلے یا معاشرتی الجھن کو موضوع بنایا گیا لیکن ایک تہذیب کی اتنی بھرپور عکاسی کی تہہ میں کچھ سنجیدہ عوامل ضرور کلبلا رہے ہیں۔"(۲۰)

اس کے علاوہ رتن ناتھ سرشار نے اپنے ناول "منی" میں بھی ایک خاص طبقے "راجپوتوں" کے رہن سہن، رسم و رواج، عادات و اطوار کو پیش کیا ہے۔ وہاں کے گلی کوچے کی ثقافت کو بھی بہت موثر انداز میں بیان

ہے وہاں راجپوت ہی بطور خاص نظر آتے ہیں۔ رتن ناتھ سر شار ہندو تہذیب و ثقافت کو بیان کرتے ہیں انہوں نے ثقافت کو بیان کرنے کے ساتھ ساتھ ہندو مسلم کے باطنی تضادات کو بھی بیان کیا ہے۔

عبدالحلیم شرر نے ناولوں میں ثقافت کی بھرپور عکاسی کی ہے۔ عبدالحلیم شرر نے سماجی واقعہ نگاری کے ساتھ ساتھ برصغیر کی تہذیب و ثقافت کو بھی بیان کیا ہے۔ انہوں نے صرف فنی لحاظ سے ہی خوبیوں اور خامیوں کو نہیں اُبھارا بلکہ انہوں نے برصغیر کی تہذیب کو واضح انداز میں پیش کیا ہے۔ شرر نے تاریخی ناول لکھے۔ اصل میں تاریخ کا تحفظ تہذیب و ثقافت کا تحفظ ہے۔ تاریخی ادب شاعری ہو یا نثر اصل میں وہ اجتماعی اور ثقافتی ذمہ داری کے سائے میں ہی پروان چڑھتا ہے اور اس کا مقصد تہذیبی و ثقافتی عناصر کی عکاسی ہے۔ مرزا ہادی رسوا نے بھی متعدد ناول لکھے جن میں "امراؤ جان ادا" اور "ذات شریف" لکھنوی تہذیب و ثقافتی پس منظر میں لکھا گیا۔ سرفراز حسین عزمی دہلوی، مرزا سعید احمد دہلوی اور پریم چند نے بھی ثقافتی مسائل کو اپنے ناولوں میں بیان کیا۔ پریم چند نے اپنے ناول اسرار معابد، ہم خرما و ہم ثواب، نرملا، بازار حسن بیوہ میں معاشرتی اور سماجی مسائل کو بیان کیا ہے جو اپنے معاشرتی ثقافت کی عکاس ہیں۔

پریم چند کے بعد اردو ادب میں بڑے بڑے ناول نگاروں کا ایک طویل سلسلہ شروع ہوتا ہے جنہوں نے مختلف حوالوں سے کہیں نہ کہیں اپنے ناولوں میں تہذیب و ثقافت، رسوم و رواج وغیرہ بیان کیا ہے جن میں ممتاز مفتی، عزیز احمد، انتظار حسین، بانو قدسیہ، مستنصر حسین تارڑ، عصمت چغتائی، اوریندر نارتھ اشک، شمس الرحمن فاروقی، رحیم گل، انتظار حسین، عبداللہ حسین، مرزا اطہر بیگ وغیرہ شامل ہیں۔ مذکورہ تمام لوگ ادبی دنیا کا قیمتی ترین سرمایہ ہیں جنہوں نے اردو ادب کو ایک بلند عالمی مقام دیا۔

ج: اختر رضا سلیمی: کوائف اور تصانیف

i. مختصر کوائف

اختر رضا سلیمی جہاں اردو شاعری کا ایک معتبر حوالہ ہیں وہیں کچھ عرصہ پہلے چھپنے والے ان کے ناولوں نے انہیں اردو فکشن میں ایک منفرد مرتبے سے نوازا۔ اختر رضا سلیمی اپنے عہد کے عمدہ لکھاریوں میں سے ایک ہیں۔ اختر رضا سلیمی نے اردو کے علاوہ ہندکو، پوٹھوہاری میں بھی لکھا لیکن تا حال ان کا دونوں زبانوں کے حوالے سے کوئی مجموعہ سامنے نہیں آیا۔ اختر رضا سلیمی کے بقول وہ مقدار سے زیادہ معیار کے قائل ہیں۔ اختر رضا سلیمی کی تخلیقی کاوشوں نے آنے والی نسلوں کو شعور دیا اور نئے موضوعات اور نئی روش سے روشناس کروایا اور اس کے علاوہ نئے اسلوبی انداز سے بھی متعارف کروایا۔

اختر رضا سلیمی کا تعلق ہزارہ کے قبیلے "کڑال" سے ہے اور اس قبیلے سے تعلق رکھنے والے افراد اپنے نام کے ساتھ سردار لگاتے ہیں۔ اختر رضا سلیمی کا پورا نام سردار محمد پرویز اختر ہے۔ ان کا تعلق ایک غریب اور عزت دار گھرانے سے ہے۔ ان کی سرکاری دستاویزات میں ان کی تاریخ پیدائش ۱۶ جون ۱۹۷۴ء درج ہے۔ اختر رضا سلیمی کل دس بہن بھائی ہیں دو بہنیں فوت ہو گئیں اور ان کا نمبر پانچویں نمبر پر آتا ہے۔ اختر رضا سلیمی کی شادی ۲۴ اپریل ۲۰۰۴ء میں نوشین سے ہوئی۔

غبار رائگانی میں گھرا تھا
میں تجھ سے آشنا ہونے سے پہلے

اختر رضا سلیمی کے تین بچے ہیں جن میں دو بیٹے اور ایک بیٹی ہے۔ ان کی شخصیت پر کشش، دلکش اور چہرے سے متانت اور سنجیدگی عیاں ہوتی ہے۔ خوش اخلاقی کا مجسم پیکر اختر رضا سلیمی خوش خوراک، خوش اخلاق اور خوددار انسان ہیں۔ اختر رضا سلیمی دبلے پتلے اور پھرتیلے نوجوان ہیں۔ دراز قد، گندمی رنگت، ستواں ناک اور تیکھے نقوش کے حامل ہیں۔ ہمہ فن شخصیت کے حامل انسان کی تحریروں میں بھی ہمیں اختر

رضا سلیمی ہی نظر آتا ہے۔ وقت کا دھارا ان کو نمایاں مقام دلانے کے ساتھ ساتھ کے فن کا لوہا منوا کر رہے گا۔

دیکھنا وقت کرے گا اختر ان کی کیا کیا تفسیریں
میں جو باتیں نادانی میں اکثر لکھتا رہتا ہوں

اختر رضا سلیمی کی پہلی تحریر جو مئی ۱۹۹۱ء میں روزنامہ جنگ میں بچوں کی صفحات پر ان کی اصلی نام محمد پرویز خان کے نام سے چھپی کچھ عرصہ قبل وہ اپنی تحریروں میں رضا، اختر رضا اور کیلو ئی کے قلمی نام استعمال کرتے رہے۔ اختر رضا سلیمی نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز نثر سے کیا لیکن کچھ عرصے کے بعد ہی وہ شاعری کی طرف چلے گئے۔ ان کے بقول ان کو شاعری کی طرف احمد حسین مجاہد نے راغب کیا۔ اختر رضا سلیمی نے باقاعدہ اردو شاعری کا آغاز ۱۹۹۳ء میں کیا لیکن ان کا پہلا شعری مجموعہ "اختراع" ۲۰۰۳ء میں شائع ہوا۔ انہوں نے مختلف موضوعات پر روزنامہ ایکسپریس میں لکھا جن میں افسانے، تنقید، طنز و مزاح، مذہب اور سیاسی کالم شامل ہیں۔

مئی ۱۹۹۱ء میں بطور پرائیویٹ طالب علم میٹرک کے امتحان میں شمولیت اختیار کی اور دوم درجے میں پاس کیا۔ ۱۹۹۵ء میں راولپنڈی بورڈ سے ایف۔ اے اور ۱۹۹۷ء میں پنجاب یونیورسٹی سے بی۔ اے کا امتحان دیا لیکن کامیاب نہ ہو سکے اور پھر علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی سے ۲۰۰۳ء میں بی۔ اے کا امتحان ۵۳ فیصد نمبر لے کر کامیاب ہوئے۔ ایم۔ اے سرگودھا یونیورسٹی سے ۲۰۱۱ء میں درجہ دوم میں پاس کیا۔ کچھ عرصہ اپنا ہفت روزہ اخبار اور اس کے بعد ایک میگزین بھی شائع کرتے رہے۔ ۱۵ مئی ۲۰۰۶ء کو اکادمی ادبیات میں بطور منیجر رائٹرز ہاؤس اپنی ملازمت کچھ ہی عرصے کی قلیل مدت کے بعد ایڈیٹر اردو ۱۵ اکتوبر ۲۰۰۷ء کو تعینات کر دیئے گئے۔ کچھ عرصہ پاکستان کے سرماہی جریدی "ادبیات" کے معاون مدیر کے طور پر بھی کام کرتے رہے اور آج کل اسی رسالے کے مدیر ہیں۔ انھوں نے ادبیات کے عام شماروں کے ساتھ ساتھ کچھ خاص نمبرز بھی نکالے اور اس کے علاوہ وہ اکادمی ادبیات پاکستان کے خبرنامے "اکادمی" کے بھی مدیر ہیں۔

ii. تصانیف

اختر رضا سلیمی کا پہلا شعری مجموعہ "اختراع" ہے جو کہ حرف اکادمی راولپنڈی نے رپور طبع سے آراستہ کیا۔ ان کا دوسرا باقاعدہ شعری مجموعہ "ارتفاع" ہے جس میں ۴۶ غزلیں اور کچھ فردیات شامل ہیں یہ بھی حرف اکادمی نے ۲۰۰۷ء میں شائع کیا۔ اختر رضا سلیمی نے "اختراع" اور "ارتفاع" کو یکجا کر کے عنوان "خوشبو میرے ساتھ چل پڑی" پر شعری مجموعہ رومیل پبلی کیشنز کے تحت ۲۰۰۹ء میں شائع کروایا۔ ان کی نظموں کا مجموعہ "خواب داں" جنوری ۲۰۱۳ء میں سانجھ پبلی کیشنز والوں نے چھاپا۔

اختر رضا سلیمی کا پہلا ناول "جاگے ہیں خواب میں" دستاویز لاہور کے زیرِ اہتمام مارچ ۲۰۱۵ء کو منظرِ عام پر آیا اور اس ناول کے ایک ہزار ایک سرورق بنائے گئے جو کہ دنیا میں کسی کتاب کے حوالے سے ایک اہم ادبی ریکارڈ ہے۔ ان کے اس پہلے ناول ہی نے انہیں جدید ناول نگاروں کی صنف میں لا کھڑا کیا جو ان کے لیے باعث اعزاز ہے۔ "جاگے ہیں خواب میں" کو ابا سین آرٹ کونسل پشاور کی طرف سے ۲۰۱۵ء کی بہترین نثری کتاب کا ایوارڈ ملا۔ "۲۰۱۱ء کی بہترین شاعری" ان کا شعری مجموعہ ہے۔ جسے تخلیقات لاہور نے ۲۰۱۱ء میں شائع کیا۔

اختر رضا سلیمی کا ناول "جندر" جو کہ ۲۰۱۷ء میں رومیل پبلی کیشنز کی زیر اہتمام شائع ہوا جس کو حال ہی میں یو بی ایل ایوارڈ بھی ملا ہے۔ اختر رضا سلیمی کی تحریریں مختلف ادبی رسائل و جرائد میں شائع ہوتی رہیں جن میں فنون، اوراق، ماہ نو، ادب لطیف، نیرنگ خیال تطبیر، روشنائی، پہچان، انگارے، بیاض، کینوس، دنیائے ادب، دستاویز چہار سو، تجدید نو، ادبیات، سیپ، تخلیقی ادب وغیرہ شامل ہیں۔ اختر رضا سلیمی کا حال ہی میں ایک جدید حالات حاضرہ کے مطابق ایک کارنامہ سامنے آیا ہے جس میں انھوں نے ایک سوفٹ وئیر ڈھائی سال کے طویل عرصے میں انتھک محنتوں سے ایجاد کیا ہے جس کا نام "حرف کار" ہے وہ اردو کی املا کو خود ہی درست کر دیتا ہے۔ یہ ان کا اردو کے حوالے سے ایک اہم ادبی کارنامہ ہے۔

پاکستان کی قومی یونیورسٹی نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگوئج کی ایک طلباء نازیہ پروین نے "اختر رضا سلیمی کی شاعری اختراع اور ارتفاع کے حوالے سے "۲۰۰۹ء میں ایم۔اے سطح کا مقالہ تحریر کیا۔ ایجوکیشن یونیورسٹی کی طالبہ رفعیہ سلیم نے اختر رضا سلیمی کے ناول" جاگے ہیں خواب میں "ایک تجزیاتی مطالعہ کے موضوع پر ۲۰۱۶ء میں ایم۔اے سطح کا مقالہ لکھا۔" جاگے ہیں خواب میں "از اختر رضا سلیمی تنقیدی جائزہ محمد سلمان اقبال نے بی۔ایس اردو سطح کا مقالہ ۲۰۱۸ء میں لکھا۔ منہاج یونیورسٹی لاہور کے طالب علم محمد فاروق لودھی نے ۲۰۱۶ء میں اختر رضار سلیمی کی ادبی خدمات کے موضوع پر ایم۔فل سطح کا مقالہ لکھا۔" جاگے ہیں خواب میں "کا تاریخی و تہذیبی مطالعہ کے عنوان سے بین الاقوامی یونیورسٹی اسلام آباد کے ایک طالب علم اسلام بہادر نے ۲۰۱۸ء میں کام کیا اور اپنی ایم۔فل کی ڈگری حاصل کی۔ جی سی یونیورسٹی فیصل آباد میں بھی ایم۔اے سطح کا مقالہ لکھا۔

حوالہ جات

۱۔ فیض احمد فیض، پاکستانی ادب، پاکستان کے اجزائے ترکیبی، مرتبہ رشید امجد، جلد اول، مئی ۱۹۸۱ء، ص ۶۰

۲۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، پاکستانی کلچر، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۱۹۸۱ء، ص ۴۲

۳۔ نظیر صدیقی، تفہیم و تعبیر، ملتان، کاروان ادب، ۱۹۸۳ء، ص ۲۸۴

۴۔ Edward B.Taylor primitive culture Vol.1 Joh Marry Ltd. London 1871, Page 1

۵۔ The Science of man in the world crisis R. Linton Ed Columbia University Press, 1945, Page 14

۶۔ اسلامک کلچر (انگریزی) مصنف ڈاکٹر ایس ایم یوسف انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک کلچر، ۱۹۷۸ء، ص ۱

۷۔ ایضاً، ص ۱

۸۔ سید امجد، پاکستانی ادب، دستکاریوں کی ثقافتی اہمیت، ترتیب و انتخاب رشید امجد، فاروق علی، ایس ٹی پرنٹرز، دریا آباد راولپنڈی، فروری ۱۹۸۲ء، ص ۱۷

۹۔ عبدالسلام خورشید، ڈاکٹر، پاکستانی ادب، مضمون ثقافت، ترتیب و انتخاب رشید امجد، فاروق علی، ایس ٹی پرنٹرز، دریا آباد راولپنڈی، فروری ۱۹۸۲ء، ص ۶۷

۱۰۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، پاکستانی کلچر، نیشنل بک فاؤنڈیشن اسلام آباد، ۱۹۹۷ء، ص ۴۱۔۴۲

۱۱۔ نصیر احمد، ڈاکٹر، اسلامی ثقافت فیروز سنز لمیٹڈ، لاہور، راولپنڈی، س ن، ص ۴۲

۱۲۔ نظیر صدیقی، تفہیم و تعبیر، کاروان ادب، ملتان، ۱۹۸۳ء، ص ۲۸۴

۱۳۔ سید امجد، پاکستانی ادب، دستکاریوں کی ثقافتی اہمیت، ترتیب و انتخاب رشید امجد، فاروق علی، ایس ٹی پرنٹرز، دریا آباد راولپنڈی، فروری ۱۹۸۲ء، ص ۱۷

۱۴۔ عثمان فاروق، ڈاکٹر، ص ۲۷

۱۵۔ عبد الرحمٰن خان، منشی دورِ جدید کے عالمگیر فتنے، جاوید اکیڈمی، ملتان، ۱۹۸۰ء، ص ۲۰۹

۱۶۔ خالد سعید، ڈاکٹر، (نگران اعلیٰ) اقبال کا نظریہ ثقافت فرحان فتح پوری، ڈاکٹر، مضمون شعبہ تحقیق و مطبوعات ادارہ ثقافت پاکستان، اسلام آباد، جون ۱۹۸۲ء، ص ۴۵

۱۷۔ عظیم الشان صدیقی، اردو ناول کا آغاز و ارتقا، ۱۹۱۴ء تا ۱۸۱۵ء، بک ٹک، لاہور، ۲۰۱۹ء، ص ۵۱

۱۸۔ نذیر احمد، توبۃ النصوح، مرتبہ افتخار احمد صدیقی، مجلس لاہور، ۱۹۶۴ء، ص ۷۔۶

۱۹۔ عثمان فاروق، ڈاکٹرء، ص ۱۹۲

۲۰۔ ایضاً، ص ۲۰۲

۲۱۔ اختر رضا سلیمی، اختراع، حرف اکادمی، راولپنڈی، ۲۰۰۳ء، ص ۸۲

باب دوم:

"جاگے ہیں خواب میں": ثقافتی عناصر کا مطالعہ

ناول دنیا کی مقبول ترین صنف ہے۔ جس کا بخوبی اندازہ نوبل یافتہ گان ناولوں کی فہرست سے لگایا جا سکتا ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ موجودہ صنعتی دور کی باریکیوں اور پیچیدگیوں کو یہی صنف سخن بہتر انداز میں بیان کر سکتی ہے۔ اردو ادب میں ناول کی صنف بہت بعد میں آئی لیکن یہ بات اب اتنی نئی بھی نہیں ہے۔ دنیا کی بڑی بڑی زبانوں کی طرح اردو ادب میں بہت زیادہ ناول لکھے گئے دنیا کا پہلا باقاعدہ ناول "مراۃ العروس" جو کہ ۱۸۶۹ء میں لکھا گیا اور ۲۰۱۹ء تک اردو ناول کی عمر پورے ڈیڑھ سو سال ہو گئی ہے۔ اس طویل عرصے میں اس صنف نے اردو ادب کو بیش قیمتی سرمایے سے نوازا۔ درجنوں ایسے ناول لکھے گئے جس نے اردو کو قابل فخر سرمائے سے نوازا جن میں اختر رضا سلیمی نے دو ناول "جاگے ہیں خواب میں" ۲۰۱۵ء میں شائع ہوا۔

ناول "جاگے ہیں خواب میں" جو کہ ۲۰۱۵ء میں شائع ہوا جس نے شائع ہوتے ہی اردو دنیا کی توجہ اپنی جانب کر لی۔ کچھ نقاد نے اسے ادبی دنیا کا اہم سنگ میل قرار دیا۔ کسی نے اسے تاریخ میں اہم اضافہ تو کسی نے اسے اردو میں طلسمی حقیقت نگاری کی سب سے اعلی مثال قرار دیا۔ اردو کے اہم ترین فکشن نگار مستنصر حسین تارڑ نے اس کے بارے میں کہا کہ "جاگے ہیں خواب میں" ناول نگاری کے فن میں ایک حیرت انگیز جست ہے۔ یہ اردو ناول کا وہ خواب ہے جو ہم مدت سے دیکھ رہے تھے اب اس کی آمد پر کھڑے ہو کر مہذب انداز میں استقبال کرنا چاہیے۔ اس ناول میں مختلف متنوع موضوعات کو زیرِ بحث لایا گیا ہے۔ جن میں سائنس، تہذیب، ثقافت، طبیعیات مابعد طبیعیات، اجتماعی لاشعور، تاریخ وغیرہ شامل ہیں اسی وجہ سے ہے اسے کثیر الموضوعاتی ناول بھی کہا جا سکتا ہے۔

"جاگے ہیں خواب میں" کو اردو ناول کی دنیا میں ایک علیحدہ شناخت کے حامل ناول کی حیثیت سے یاد رکھے جانے کا قطعی امکان ہے۔ ممتاز حسن خان نے اس ناول پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ ایک کثیر الجہتی ناول ہے اور اس کے حوالے کئی اور مباحث اٹھائے جانے لازم ہے۔ فرائیڈ نے لاشعور اور خوابوں کے حوالے سے جو تصور دیا اس کے حوالے سے اردو ادب میں بہت زیادہ لکھا گیا لیکن نظریہ لاشعور اور نظریہ خواب کے حوالے سے میری معلومات کے مطابق یہ پہلا ناول ہے۔

اس ناول کی ایک اور اہم بات یہ ہے کہ اس پر ایک ہزار ایک سرورق بنائے گئے جو آٹھ ماہ کے طویل عرصے میں مکمل ہوئے یوں اس کے پہلے ایک ہزار ایک نسخوں سرورق نہ صرف اوریجنل پینٹنگ پر مشتمل تھا بلکہ وہ تمام سرورق ایک دوسرے سے مختلف تھے۔ یہ تمام سرورق ممتاز مصور اور اختر رضا سلیمی کے گہرے دوست وصی حیدر نے انتھک محنت سے بنائے۔ بی بی سی اردو کے مطابق یہ اپنی نوعیت کا پہلا تجربہ تھا اسے گنیز بک آف ورلڈ ریکارڈ میں شامل کرنا چاہیے۔ ان تمام باتوں کے ساتھ ساتھ یہ ناول اردو میں اس لیے بھی مقبول ہوا کیونکہ یہ اپنے اسلوب کے ساتھ ساتھ تکنیک کے حوالے سے بھی ایک نیا تجربہ تھا۔

الف: "جاگے ہیں خواب میں" کے ماحول کا مطالعہ: ثقافتی تناظر میں

اختر رضا سلیمی کا ناول "جاگے ہیں خواب میں" عنوان سے ہی ایک انوکھا اور اچھوتا ناول ہے اس میں انھوں نے ہزارہ کی برف پوش پہاڑوں اور فلک بوس مناظر کے علاوہ وہاں کی وادیوں ، سرسبز و شاداب میدانوں صاف شفاف چشموں اور ندیوں پر مشتمل خطے کا ذکر کیا ہے چونکہ بالخصوص ٹیکسلا بدھ تہذیب کا مرکز ہے۔

ہری پور ہزارہ ٹیکسلا سے قریب تر ہونے کی وجہ سے ان کی تہذیب و ثقافت ماحول اور اعتقاد پر بدھ تہذیب کے اثرات واضح نظر آتے ہیں۔ یہ خطہ حسن و شادابی کے ساتھ ساتھ تہذیبوں کا بھی مسکن رہا۔ دارالسلطنت تھا اسی وجہ سے یہاں مختلف تہذیبوں مثلاً ایرانی، ہندوستانی اور یونانی تہذیبوں کا امتزاج نظر

آتا ہے۔ اس وقت برصغیر کا سب سے بڑا اور اہم تعلیمی مرکز ٹیکسلا تھا بڑے بڑے امراء، مہاراجے اور نوابوں اور برہمنوں کے بچے یہاں تعلیم حاصل کرنے آتے تھے یہ درس گاہیں معیاری تعلیم اور اعلیٰ تعلیم کی وجہ سے بہت مشہور تھیں بڑے بڑے مہاراجوں کے لیے الگ الگ درس گاہیں قائم کی گئی تھیں جن میں وہ مختلف فنون سیکھتے تھے اس کے علاوہ مختلف درس گاہیں قائم کی گئی تھیں جن میں طب، تیر اندازی، فنون لطیفہ، معاشیات، مختلف زبانیں، جغرافیہ اور دوسرے علوم سکھائے جاتے تھے تعلیمی اور ثقافتی لحاظ سے یہ ایک بین الاقوامی شہر بن گیا اور مہاراج اشوک کے دور میں بھی یہ بدستور بحال رہا اور علم و ادب کا گہوارہ بنا رہا۔ اختر رضا سلیمی نے اس حوالے سے اپنے ناول میں یوں ذکر کیا ہے: ''آنند جو فلسفہ نجوم، تقویم، ریاضی، اتہاس، قانون، جغرافیہ سیاست، طب، فلکیات، حتیٰ کہ فنِ حرب، عطر کشی، شراب کشی، سنگ تراشی، سکہ سازی اور گھڑ سواری جیسے متنوع علوم و فنون کا استاد مانا جاتا ہے۔ "مہاراج اشوک کے دور میں اس نے مختلف چٹانوں پر مختلف فرمان مقدس کندہ کروائے جن اخلاقیات و اقدار پر عمل کر کے لوگ اپنے ماحول اور کردار میں مثبت تبدیلی لائے اس ماحولیاتی رسم کا آغاز خامنشی حکومت نے کیا جس کو مہاراج اشوک نے بھی جاری رکھا۔ انھوں نے لوگوں کی اخلاقی و روحانی تربیت کے لیے مختلف شاہراؤں پر فرمان کنندہ کیے ان تمام فرامین میں سے چودہ فرامین دریافت ہوئے اور لوگوں کو حاصل کردہ تجربات سے آگاہ کرنے کا اہم ذریعہ بنی اور یہ عبارات مختلف جگہ کنندہ کیں۔ ناول میں چودہ فرامین کا تذکرہ کیا جس میں سے ایک کا ذکر اختر رضا سلیمی نے ناول ''جاگے ہیں خواب میں'' یوں کیا ہے:

> ''مہاراجہ کی خواہش ہے کہ ہر جگہ پر طبقے کے لوگ اطاعت گزار ہیں کیوں کہ ہر کوئی چاہتا ہے کہ وہ اپنے حواس پر قابو رکھے اور اس کا ذہن پاک صاف رہے۔ البتہ مردوں کو اپنی خواہشات اور پسند پر قابو رہتا کچھ لوگ احکامات پر پورا پورا عمل کریں گے اور کچھ جزوی طور پر حتیٰ کہ کسی ایسے شخص کے نزدیک بھی، جو مکمل طور پر آزادہ روی کا قائل ہو، اپنے حواس کو قابو رکھنا، ذہن کی پاکیزگی، احسان مندی اور وفاداری ہمیشہ قابل تعریف رہی ہیں۔''(۲)

یہ عبارت فروشی رسم الخط میں لکھی گئی جو کہ ساتویں صدی عیسوی تک ٹیکسلا میں عروج رہنے کے بعد متروک ہو گیا اور اس کی جگہ دوسرے رسم الخط دیوناگری نے لے لی۔ ناول میں ایک زرعی معاشرہ اور ان کے ماحول کو اجاگر کیا ہے زرعی معاشرے میں زیادہ تر لوگ پالتو جانور مثلاً بکری، گائے، بھیڑوں سے دور رہی، لسی، مکھن اور گھی حاصل کرتے اور اپنی معاشی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے انہیں کا کاروبار بھی کرتے ہیں وہاں کے لوگ اساطیر، توہمات، قصہ گوئی پر زیادہ یقین رکھتے ہیں اور یہی تمام باتیں ان کے ماحول میں بھی نظر آتی ہیں ناول کے کردار علی احمد نے مرنے کے بعد بارش کا مسلسل برسنا اور رکنے کا نام ہی نہ لینا ان کے خیال میں علی احمد کی وجہ سے ہوا کیونکہ وہ ایک نیک آدمی تھا گاؤں میں اگر کوئی فوت ہو جائے اور اس کے مرنے کے بعد بارش ہو تو اس خاتون یا مرد کو نیک تصور کیا جاتا ہے۔ ہزارہ میں بھی لوگ ایسی اعتقادی باتوں پر یقین رکھتے ہیں۔

> ''علی احمد نیک آدمی تھا، شلوار کے پائینچے اڑسے، سروں پر بوریوں کے منڈاسے رکھے، ایک مکان کے پرنالے کے نیچے سے گزرتے ہوئے دو آدمیوں میں سے، ایک نے دوسرے سے کہا۔ ہاں خان تبھی تو رحمت برس رہی ہے۔ پچھلے سال تو بادل امڈنے کا نام ہی نہیں لے رہے تھے۔''(۳)

اسی ناول میں جابجا خوبصورت وادیاں، ہر پیچ راستے، دریاؤں کی جولانی، صاف شفاف پانی کے چشمے اور ندیاں، ہر جگہ شور مچاتی آبشاریں ایک طلسماتی ماحول تخلیق کر دیتی ہیں جو انسان کو مبہوت کر دیتا ہے اور انسان کئی دنوں تک اس کے سحر سے نہیں نکل پاتا۔ اس ناول میں کئی جگہ ناول نگار نے اساطیری واقعات، توہمات کا ذکر بھی کیا ہے جو پنجاب کے دیہات کی تہذیب و ثقافت کا بنیادی حصہ ہے۔ بیسویں اور اکیسویں صدی میں اگرچہ سائنس نے کافی حد تک ترقی کی ہے اور انسانی رویوں کو تبدیل کرنے میں مثبت کردار ادا کیا ہے اور انسان سائنسی طرز فکر سے متاثر ہوا ہے لیکن ان تمام تاویلات کے باوجود ابھی بھی ترقی پذیر ممالک کے ساتھ ساتھ ترقی یافتہ ممالک کے لوگ ایسی ہی اساطیری باتوں پر یقین رکھتے ہیں اسی وجہ سے یہ ہمارے ماحول کا حصہ ہیں۔

زمان ناول کا مرکزی کردار ہے جو بنیادی طور پر ایک معزز اور امیر گھرانے سے تعلق رکھتا ہے اس کے آباؤاجداد آٹھ پشتوں سے معاشی و معاشرتی طور پر بہترین اثر ورسوخ کے مالک تھے۔ اپنا بچپن کا کچھ حصہ نور آباد میں گزارا جو بنیادی طور پر ایک گاؤں ہے اور وہاں کی بود وباش رہن سہن خالصتاً دیہاتی ہے۔ ناول کے کردار ان کے لباس انداز واطوار تمام اسی ثقافت کی عکاس ہے۔

اختر رضا سلیمی ناول کے اس کردار سے یہ ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ انسانی ذہن میں یہ صلاحیت ہوتی کہ وہ ماضی، حال، مستقبل میں جی سکے ناول کا مرکزی کردار زمان بھی اسی صلاحیت کا مالک ہے، ڈاکٹر صلاح الدین درویش نے "جاگے ہیں خواب میں "ناول پر بات کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

> "ناول میں موجود حیرت سے متعلق گمان کے منطقی بیانیے کے دوسرے بڑے وقوع کا تعلق زمان کے اس ذہنی کیفیت کے ساتھ ہے کہ جس انسلاک، حال، ماضی اور ماضی بعید کے علاوہ مستقبل کے ساتھ بھی ہے۔ اختر رضا سلیمی کی نظر میں اگر کوئی جیتا جاگتا انسان حال میں رہتے ہوئے تاریخ میں مدفون زمانوں کا ایک کردار ہو سکتا ہے تو کیا عجب وہ آئندہ زمانے میں ایک زندہ انسان کے طور پر زندگی بسر کر رہا ہو۔ کم از کم مستقبل قریب میں ہونے والے واقعات کی وہ درست نشان دہی ضرور کر سکتا ہے کیونکہ وہ بطور انسان اپنے کردار کے باعث مستقبل میں بھی "زندہ" ہے۔"(۴)

اختر رضا سلیمی کے اس ناول میں زیادہ تر کردار حال سے ماضی اور ماضی سے حال کی طرف جھانکتے دکھائی دیتے ہیں لیکن زمان کا کمال یہ ہے کہ وہ ماضی اور حال کے علاوہ مستقبل میں بھی جھانکتا ہوا نظر آتا ہے۔ زمان کے والد جو ناول کا مرکزی کردار نہ ہونے کے باوجود اس ماحول کی عکاسی بہتر انداز میں کرتے ہیں ان کا شمار گاؤں کے معزز امراء میں ہوتا ہے۔ انہوں نے گاؤں کی ایک بستی جس کا نام بھی انہی کے نام پر نورآباد رکھا گیا۔ لوگوں کی فلاح وبہبود کے لیے بہت زیادہ کام کیا۔ گاؤں کے لوگ ان کو عزت واحترام کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ عمومی طور پر ناول کو کرداروں کے ذریعے آگے بڑھایا جاتا ہے اور کردار مصنف کی گرفت میں ہوتے ہیں، وہ ان کرداروں سے جس طرح کا کام لینا چاہے لے سکتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ وہ جس طرح

چاہتا ہے کر داروں سے گفتگو بھی کرواتا ہے۔ کر دار کا زیادہ تر انحصار مصنف پر ہو تا ہے۔ وہ چاہے کو کر دار تو زندہ رکھے اور چاہے تو کر دار کو مر وادے اس ناول میں متعدد کر دار سامنے آتے ہیں جن میں سے ایک کر دار عر فان کا ہے جو عجیب و غریب حرکات کر تا دکھائی دیتا ہے۔ یہ ایسا کر دار ہے گاؤں میں اچانک سے نمودار ہو جاتا ہے اور اکثر اوقات اچانک منظر عام سے غائب ہو جاتا ہے۔ عر فان کے خیالات اور شخصیت کو دیکھ کر یہ احساس ہو تا ہے اس نے سر اغ زندگی پالیا ہے اور وہ ایک وسیع النظر انسان ہے۔

ڈاکٹر کلیم، اکبر خان، عزیز خان، عبد اللہ، نور خان، احمد خان، سید احمد بریلوی، ظفر علی خان اور صابرہ خان یہ تمام ایسے کر دار ہیں جو اس ماحول میں رہتے ہیں۔ گاؤں کی رہن سہن کے ساتھ ساتھ ان کے ماحول اور کر دار میں مثبت تبدیلیاں بھی نظر آتی ہیں اور تمام کر دار ایک دوسرے سے جڑے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ہر کر دار اپنے فن میں ماہر ہونے کے ساتھ ساتھ معاشرے میں ایک الگ مقام رکھتا ہے۔ اختر رضا سلیمی کے ناول میں ماحول کی مسحور کن منظر نگاری بھی ہمارے سامنے آتی ہے جس میں آبشاریں، ندیاں، سر سبز و شاداب کھیت، پہاڑ، غار جگہ جگہ نظر آتے ہیں اور ان کی منظر نگاری قاری کو اپنے طلسم میں لے لیتی ہے اور قاری کا جی چاہتا ہے کہ وہ جلد ہی ایسے علاقے کی سیر کرے۔ اختر رضا سلیمی نے اس ناول میں منظر نگاری کو جس طرح جذبات نگاری سے جوڑا ہے وہ ان کے جمالیاتی ذوق کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''چبوترے پر مغرب کی طرف رخ کر کے کھڑا ہو جائے تو دائیں اور بائیں جنگلی اناروں کی جھاڑ جھنکاڑ، پاؤں کی سمت غار کا دہانہ، جس کے نشیب میں میل بھر کے فاصلے پر ایک بستی اور پشت کی طرف بتدریج بلند ہوا پہاڑ ہے۔ جس کی چوٹی چیڑ کے درختوں سے ڈھکی ہوتی ہے غار کے عقب میں عین اس جگہ پر، جہاں سے ہموار زمین یک دم بلند ہونا شروع ہو جاتی ہے، چیڑ کا ایک درخت ڈار سے بچھڑے ہوئے پرندے کی طرح تنہا کھڑا ہے۔ جس کا تنا اتنا موٹا ہے اگر دو آدمی اس کے حد دو تنے کے گرد آمنے سامنے بازو پھیلا کر اسے اپنے کلائیوں میں لینے کی کوشش کریں تو ان کے ہاتھوں کی انگلیاں بمشکل ہی ایک دوسرے کو مس کر سکیں۔''(۵)

اس ناول میں صاف و شفاف چشموں، پہاڑوں، درختوں اور میوہ جات وغیرہ کا ذکر جگہ جگہ موجود ہے اس ناول کے پیچھے اختر رضا سلیمی کا ایک گہرا اور زبردست جمالی ذوق کار فرما ہے۔ فطرت کا مصور ہے ایک

کامیاب تخلیقی کارنامے کے پیچھے اہم وجہ تخلیق کار کا بہترین مشاہدہ ہوتا ہے جو اس ناول میں جگہ جگہ نظر آتا ہے۔ مشاہدہ مضبوط ہونے کے ساتھ ساتھ مصنف فطرت کا مداح نظر آتا ہے جو فطرت کو اتنے قریب سے دیکھتا ہے، محسوس کرتا ہے اور انہیں الفاظ میں بیان کرنے کی صلاحیت بھی رکھتا ہے۔ قاسم یعقوب نے لکھا ہے:

> ''اختر رضا سلیمی نے مشاہدہ بینی کے کمال جوہر پارے اکٹھے کر دیے ہیں جب بارش ہوتی ہے اور فقیر محمد خان گھر کے ملبے سے باہر نکالا جاتا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ یہ منظر واقع میں آنکھوں کے سامنے کھلا ہوا ہے۔''(۶)

اس ناول کے کردار اور ماحول میں ثقافت اچھی طرح رچی بسی نظر آتی۔ اوڑھنا، بچھونا، رسم و روایات الغرض ہر چیز ثقافت کی عکاسی کرتی ہے۔ ان کی زبان، مافوق الفطرت واقعات پر یقین، توہمات پرستی کے موقعوں پر ہونے والی رسومات علوم و فنون، ارد گرد سڑکیں، راستے اور اشیاء کا استعمال مثلاً لکڑیاں اور لکڑی سے بنی دستکاریاں اور جیگن کا استعمال ان کے ہر قول و فعل سے کردار اور ماحول دونوں میں ثقافت جھلکتی ہے۔ کیونکہ وہ پہاڑی علاقہ ہے وہاں بارش اور برفباری نسبتاً زیادہ ہوتی ہے اس لیے ان کے ماحول میں آبشاریں اور بارش کا تذکرہ بھی ناول میں زیادہ ہے۔

ب: جغرافیائی مآخذ کے ثقافتی عناصر

i. لباس

لباس کے لغوی معنی پوشاک، جامہ، کپڑے ہیں اور اصطلاحی معنی میں اس سے مراد خود کو ڈھانپنا ہے۔ لباس انسانی شخصیت کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ ہر علاقے کا لباس اس کی ثقافت اور اس کے ماحول کی وضاحت کرتا ہے۔ اکثر سرد علاقوں میں گرم لباس پہنا جاتا ہے اور وہ گرم لباس اس کے علاقے کی نمائندگی کرتا ہے۔ مختلف علاقوں میں پہنے اوڑھنے کے انداز و اطوار مختلف ہوتے ہیں۔ مثلاً کسی علاقے میں شلوار قمیض عام رواج

ہے اور کسی علاقے میں فراک زیادہ پہننے جاتے ہیں زیادہ تر لوگ ماحول کی مطابقت سے ہی لباس مختص کرتے ہیں۔ اس ناول میں موجود کرداروں کے لباس پر غور کیا جائے تو وہ ثقافتی ہونے کے ساتھ ساتھ ماحول سے بھی مطابقت رکھتے ہیں۔ مثلاً اختر رضا سلیمی کے ناول میں موجود کردار یہ قیاس کرتا ہے کہ آج وہ تین پاجامے پہن کر باہر جائے گا۔ ناول میں لکھتے ہیں کہ "آج تین پاجامے جتنی ٹھنڈ پڑے گی" اس نے سوچا کہ وہ سردی کو ہمیشہ پاجاموں کی تعداد سے ہی ناپتا تھا جتنی زیادہ سردی اتنے زیادہ پاجامے۔"(۷) ناول میں "جاگے ہیں خواب میں" اختر رضا سلیمی پاجامے کے حوالے سے ذکر کرتے ہیں کہ اس علاقے کے لوگ لباس میں پاجامے پہنتے ہیں کیونکہ اس علاقے میں زیادہ تر گرم کپڑوں کا استعمال ہوتا ہے۔ اور اس اقتباس سے ظاہر بھی ہوتا ہے کہ سردی میں ٹمپریچر کس قدر نقطہ انجماد سے گر جاتا ہے اور سردی کی شدت بہت زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ اس لیے کردار نے کہا کے جتنی سردی ہو گی اتنے زیادہ پاجامے پہنے گا۔

جن جن علاقوں میں موسم سرما بہت سرد رہتا ہے اور دیر تک رہتا ہے۔ ان علاقوں میں لوگ سردی سے بچنے کے لیے مختلف تدبیریں کرتے ہیں۔ کپڑوں کے معاملے میں بہت احتیاط برتتے ہیں کیونکہ اگر لباس کا خاص خیال نہیں رکھیں گے تو سخت سردی کی وجہ سے یقینی طور پر بیمار ہو سکتے ہیں۔ اس لیے وہاں کے لوگ بوڑھوں اور بچوں کا خاص طور پر اس حوالے سے خاص خیال رکھتے ہیں۔ سردی کا موسم انھیں مجبور کر دیتا ہے کہ وہ اونی اور موٹے لباس کو ترجیح دیں۔ اس لیے ان علاقوں کے لوگ دو سے تین پاجامے پہن کے رکھتے ہیں کیونکہ رات تو ٹھنڈی ہوتی ہے لیکن صبح کا منظر بھی اندھیرا ہی دکھاتا ہے۔ جب کالے بادل چھائے ہوں اور بارش یا برف باری زیادہ ہو رہی ہو تو اس اثنا میں لوگ گھروں سے باہر کم نکلتے ہیں بستروں گھسے رہنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ ناول نگار نے موسمِ سرما کے حوالے سے لباس کی طرف نشاندہی یوں کی ہے:

> "کپڑوں کے نیچے پڑے تین موٹے پاجامے اور اسی سے ملتی جلتی پورے بازوؤں والی تین شرٹیں باہر نکالیں اور جسم پر پاجاموں اور شرٹوں کی تہیں چڑھانے لگا تین تہوں کے بعد اس نے وہی موٹی شلوار قمیض پہنی جو اس نے ابھی ابھی اتاری تھی۔ پھر اس

نے ٹرنک سے موزوں کے دو جوڑے نکال کر اوپر نیچے پہنے اور میز کے نیچے رکھے ہوئے لیدر کے بوٹ نکال کر پہننے لگا جنہوں نے پاؤں کے ساتھ ساتھ اس کی پنڈلیوں بھی ڈھانپ لیا۔ بوٹوں کی زیپ بند کرنے سے پہلے اس نے شلوار کے پائنچے احتیاط سے بوٹوں کے اندر کیے۔ کھونٹی پر ٹنگا ہوا لیدر کا اوور کوٹ اتار کر پہنا جس کا گھیرا اس کی پنڈلیوں کو بھی حصار میں لیے ہوئے تھا۔ پھر ایک گرم مفلر اور ٹوپی سے سر اور گردن کو یوں ڈھانپا کہ آئینے کا سامنا کرتے ہوئے۔ اپنی آنکھوں کی گہرائی میں اترے بغیر۔ وہ خود کو پہچان نہ پایا۔"(۸)

موسم سرما میں لوگ موٹے موٹے گرم اونی پاجامے پہن کر کام کرتے ہیں اور سوتے ہیں۔ پاجاموں کے ساتھ ساتھ موٹی شلوار بھی پہنتے ہیں۔ قمیض کے نیچے بھی موٹی موٹی اونی سوئیٹر پہنتے ہیں۔ اس قسم کے لباس سے صاف پتا چلتا ہے کہ موسم سرما میں سردی کی شدت کس حد تک بڑھ جاتی ہے۔ کپڑوں کے ساتھ ساتھ جوتے بھی لیدر کے ہی پہنتے ہیں جن کی وجہ سے سردی لگنے کا خطرہ کم ہوتا ہے۔ موزے کے دو جوڑے تو سب ہی نکال کر رکھتے ہیں ایک جوڑا میلل ہو جائے تو دوسرا جوڑا استعمال میں لایا جاتا ہے۔ اور لیدر کے کوٹ بھی اتنے لمبے ہوتے ہیں کہ پنڈلیوں کو آسانی سے ڈھانپا جاسکتا ہے۔ اس لیے اس ناول میں بھی ناول نگار نے دو دو موزوں کے جوڑے پہننے کا تذکرہ کیا کیونکہ وہاں سردی زیادہ ہوتی ہے۔ موٹے دھاگے سے تیار کی گئی ٹوپیاں پہنی جاتی ہیں اور ٹوپی پہن کر اس کے اوپر مفلر اس طرح لپیٹا جاتا ہے کہ صرف آنکھیں نظر آتی ہیں وہ بھی بہت تھوڑی کیونکہ کانوں اور ناک کو بھی ڈھانپا جاتا ہے تاکہ ٹھنڈی ہوا نہ لگے کیونکہ بیمار ہونے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ مندرجہ بالا اقتباس میں ناول نگار نے سخت سردی میں اس علاقے کے لباس کی نشاندہی کی ہے۔

"جوں ہی کپڑے بدل کر وہ غسل خانے سے نکلا، ایک ادھیڑ عمر شخص لیدر کے بوٹوں کا جوڑا۔ ایک گرم اوور کوٹ اور مفلر ہاتھ میں تھامے اس کا منتظر تھا جیسے وہ اس کے ارادوں تک سے باخبر ہو۔ اس نے جوتے اس کے سامنے رکھے، اسے اوور کوٹ پہننے میں مدد دی اور مفلر اس کی طرف بڑھایا۔ اس نے مفلر گردن کے گرد لپیٹا اور دروازے سے باہر نکل گیا۔"(۹)

جس تناظر میں یہ ناول لکھا گیا وہاں سردی ہونے کی وجہ سے لیدر کا استعمال زیادہ کیا جاتا ہے کیونکہ لیدر میں سردی لگنے کا امکان کم ہوتا اس میں ہوا کا گزر نہیں ہوتا اس لیے لوگ کپڑوں کی جتنی بھی تہیں چڑھا لیں مگر لیدر کی جیکٹ ضرور پہنتے ہیں وہاں پر برساتی کی جگہ زیادہ تر لوگ بارش سے بچنے کے لیے لمبے لیدر کے کوٹ پہنتے ہیں جو تقریباً پورا ان کو ڈھک لیتے ہیں اور وہاں کے معاشرے میں اس لمبے کوٹ پہننے کو عیب نہیں سمجھا جاتا ہے۔ جاڑے کے موسم میں درجہ حرارت منفی ہونے کی وجہ سے گرد کے گردہ مفلر الگ اور سر کو الگ ڈھانپتے ہیں یعنی گردن کو الگ سے کور کرنا پڑتا ہے اور مرد حضرات سر کو الگ سے ڈھانپتے ہیں۔

اسی طرح ناول نگار نے دوسرے اقتباس میں جس علاقے کی ثقافت کو بیان کیا ہے اس علاقے میں لوگ سردی کی شدت کی وجہ سے خصوصاً جاڑے کے موسم میں لیدر کی جیکٹ اور بوٹوں کا استعمال زیادہ کرتے ہیں اور مرد اپنے لباس میں مفلر کو بنیادی حصہ سمجھتے ہیں۔

ایبٹ آباد کی ثقافت میں لباس کے ساتھ ساتھ زندگی کی باقی ضروریات کی اشیا بھی بہت معنی رکھتی ہیں۔ سردی کے موسم میں وہ چادر کا استعمال کثرت سے کرتے ہیں۔ کسی کے گھر مہمان بن کے بھی جانا ہو یا بازار سے خریدی کرنی ہو یا پھر جنگل سے لکڑیاں کاٹنی ہوں چادر اپنے ساتھ رکھتے ہیں۔ جس طرح چادر اوڑھنا عورت کے لیے ضروری ہے اسی طرح یہاں کے لوگ چادر کا استعمال کثرت سے کرتے ہیں۔ دورِ حاضر میں اگر ہم درختوں کے کاٹنے کی بات کریں تو آج کے دور میں لوگوں اپنی آسانی کے لیے موٹر سے چلنے والی بڑی بڑی آریاں استعمال میں لاتے ہیں۔ بڑے سے بڑے درخت بھی بآسانی کاٹ لیتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ جس طرح دور قدیم سے بیسویں صدی تک آج بھی کچھ لوگ کلھاڑی کا استعمال کرتے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے درختوں کے لیے کلھاڑی کا استعمال کرتے ہیں۔ ناول نگار نے بھی ایبٹ آباد کی ثقافت کے حوالے اس ناول کے ایک کردار کو دکھایا ہے۔ اختر رضا سلیمی لکھتے ہیں " فقیر محمد نے اپنی چادر، کوٹ اور رسہ، غار کے پتھریلے چبوترے پر رکھے اور کلھاڑی لے کر وہاں سے غائب ہو گیا۔"(۱۰)

اس ناول میں ایک کردار فقیر محمد کا حلیہ بتاتا ہے کہ اس علاقے میں چادر اور کوٹ کا استعمال بکثرت نظر آتا ہے۔ ہزارہ کے مختلف مضافات میں اضلاح میں لوگوں کا زیادہ تر رجحان کوٹ اور چادر کی طرف ہے۔ چادر کو عزت و تکریم کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ اور بزرگ اسے اپنے روایت کا اہم حصہ سمجھتے ہیں کیونکہ یہ ان کے پرکھوں سے چلا آرہا ہے۔ جیسا کہ ناول نگار نے چادر کی روایت کو برقرار رکھا۔ یعنی کسی بھی واقعہ میں اس ناول کے کردار لباس کے حوالے اس علاقے کی ثقافت کے ساتھ جڑے نظر آتے ہیں۔ مہاراج سے لے کر جنگل میں لکڑیاں کاٹنے والے لکڑہارے تک چادر کو عزت دیتے ہیں۔ اور کوٹ کا استعمال کرتے ہیں کیونکہ جب ڈاکٹر مسیح الدین فاروقی زمان کے سامنے آتے ہیں تو وہ اپنے آپ کو مہاراج اشوک کا خاص بندہ ظاہر کرنے کے لیے بھی کوٹ ہی پہنتے ہیں۔

اس ناول میں موجود کرداروں کے لباس پر غور کیا جائے تو پتا چلتا ہے وہ ماحول سے مطابقت کے ساتھ ساتھ موقع کی مناسب سے ہوتے ہیں۔ یعنی اگر کوئی بزرگ کسی بیٹھک کے لیے جاتا ہے تو وہ لازماً سفید لباس میں ہی ملبوس نظر آئے گا۔ یہ اس علاقے کی ثقافت ہے کہ سفید لباس کو خاص عمر کے لوگوں کے لیے مختص کیا گیا ہے اور اس کو عاجزی کی علامت بھی سمجھا جاتا ہے۔ جب بھی کوئی فرد پنچایت میں بیٹھتا تو وہ سفید لباس ہی پہناتا تھا اور اگر کسی امرا کے گھر جاتے تو بھی سفید لباس ہی پہنتے تھے۔ اس لیے جب وہ زمان کو ملنے نور احمد کے گھر آئے تو انہوں نے سفید لباس پہن رکھا تھا کیونکہ نور خان اپنے علاقے میں سردار کی حیثیت رکھتا ہے جس نے اپنے علاقے میں لوگوں کے لیے بہت کام کیا جس کی وجہ سے لوگ اس کی بہت عزت کرتے تھے۔

اور ان کے گھر جانے والے بھی سفید لباس کا ہی انتخاب کرتے تھے۔ زیادہ تر بزرگ، نوجوان سفید لباس میں ملبوس نظر آتے ہیں۔ اسی لیے ناول نگار نے ماحول کے ساتھ ساتھ بالخصوص سفید لباس کا تذکرہ ناول میں یوں کیا ہے۔ "سفید لباس میں ملبوس دو اشخاص میں سے ایک، اس کے پاؤں کی طرف رکھے ہوئے کاغذات کو الٹ پلٹ رہا تھا۔"(۱۱)

ہر علاقے کے لوگوں کے لباس ثقافت کے ساتھ ساتھ ماحول کے مطابق ہوتے ہیں مثلاً سردیوں کے موسم میں مفلر کوٹ، چادر، موٹے پاجامے یا گرم لباس استعمال کیے جاتے ہیں اسی طرح موسم گرما میں لوگ گرمیوں کے لباس مثلاً ہلکے پھلکے کپڑے پہنے جاتے ہیں۔ لباس دنیا کے زیادہ تر علاقوں میں اپنی اپنی تہذیب و ثقافت کے مطابق پہنا جاتا ہے اور ان روایات میں ثقافتی روایات، مذہبی روایت ماحولیاتی اور جغرافیائی عوامل کا بھی نمایاں کردار ہے۔ جغرافیائی عوامل کے ساتھ ناول کے کردار زمان کو جس علاقے کے جس ماحول میں دکھایا گیا اسی تناظر میں اس علاقے کی ثقافت بھی ہمارے سامنے آتی ہے۔ مثلاً سردیوں میں موٹے اور گرم لباس کا گرمیوں میں ہلکے پھلکے لباس کا استعمال کیا جاتا ہے۔ اکثر و بیشتر علاقوں میں سردی اور گرمی میں ایک جیسے کپڑوں کا استعمال کیا جاتا ہے۔ کیونکہ وہاں کی ثقافت اور ماحول انہیں ہلکے کپڑے پہننے کی اجازت نہیں دیتا۔ ناول میں اختر رضا سلیمی نے گرمیوں کے لباس کا ذکر کیا ہے۔

> "پاجاموں کی جو تہہ اس نے اپنے بدن پر چڑھائی تھی، وہ موجود نہیں تھی۔ اس نے اپنے بدن کو ٹٹولا اور ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ اس نے دیکھا کہ وہ گرمیوں کے ہلکے پھلکے لباس میں ملبوس ہے۔"(۱۲)

اختر رضا سلیمی نے جس لوکیل میں یہ ناول تخلیق کیا وہاں سردیوں کے موسم میں زیادہ موٹے کپڑے کا ہی رواج تھا لیکن گرمیوں کے موسم میں گرمی کی شدت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اور اپنی معاشرتی حدود کے پس منظر میں گرمیوں میں لوگ شلوار قمیض ہی پہنتے ہیں لیکن وہ کپڑا سردیوں کے کپڑے کی نسبت ہلکا ہوتا ہے یہی ان کے ثقافتی لباس کا حصہ ہے۔ الغرض "جاگے ہیں خواب میں" ناول میں ناول نگار نے ماحول کے ساتھ ساتھ معاشرتی اصول و ضوابط کے تحت ان کے ثقافتی لباس کو بیان کیا ہے۔ ہر علاقے کی حفاظت کے لیے کچھ خاص ادارے قائم کیے جاتے ہیں ان کے مخصوص لباس ہی ہوتے تاکہ دوسرے آنے والے لوگ ان کے لباس سے ہی ان کو پہچان لیں جس طرح فوجی کے لیے وہاں خاکی لباس تھا جس کا ذکر اختر رضا سلیمی نے ناول میں کیا۔

ii. بود و باش

دنیا کے کرہ ارض پر تقریباً دو سو سے زائد ممالک موجود ہیں۔ تمام ممالک میں بسنے والے لوگ کیونکہ الگ الگ خطے سے تعلق رکھتے ہیں اس لیے ان تمام خطوں میں بسنے والے افراد کا الگ الگ بود و باش ہے ان تمام خطوں میں بھی مقامی سطح پر رہن سہن کے حوالے سے تنوع پایا جاتا ہے۔ ثقافت در حقیقت میں کسی معاشرے کے عقائد، رہن سہن اور طور طریقے کا نام ہے۔ عقائد کے حوالے سے مذہب اس میں بنیادی محرک کا کردار ادا کرتا ہے جو زیادہ تر اس علاقے کے رسم و روایات، رہن سہن، طور طریقے، رنگ ڈھنگ پر اثر انداز ہوتا ہے۔

کسی بھی جگہ، ملک یا علاقے میں رہنے والے لوگوں کے انداز و اطوار، رسم و رواج، اوڑھنے، بچھونے اور رہن سہن کے طریقے مختلف ہوتے ہیں۔ مختلف علاقوں میں ان کے تمام اطوار اور رسومات پر مذہب کی گہری چھاپ نظر آتی ہے۔ کسی بھی قوم کی ثقافت اس کی پہچان ہوتی ہے۔ اور وہاں کے افراد نہ صرف اس کا احترام کرتے ہیں بلکہ اپنی تہذیب و ثقافت کو بچانے کے لیے جان کی بازی بھی لگا دیتے ہیں۔ کیونکہ کسی بھی معاشرے کی تہذیب و ثقافت ہی وہ واحد وجہ ہوتی ہے جو لڑی کی صورت تمام افراد کو آپس میں پروے رکھتی ہے اور تمام افراد کو متحد اور یکجا رکھتی ہے۔ مختلف دیہاتوں میں لوگوں کے رہن سہن کے انداز مختلف ہوتے ہے لیکن ان کے انداز و اطوار، رہن سہن کا طریقہ اور سلیقہ اس بات کا پتا دیتی ہے کہ وہ کہاں سے تعلق رکھتے ہیں مثلاً اگر کوئی عورت ساڑھی پہنے اور گلے میں منگل سوتر پہنے جو ان کی مذہبی علامت ہے (لڑکے لڑکی کے گلے میں منگل سوتر پہنانا نکاح کے ضمرے میں آتا ہے) اور وہ آکر مسلمان ہونے کا دعویٰ کرے تو ایسا ممکن نہیں کہ کوئی اس کی باتوں کو من و عن قبول کرلے دراصل انسان کا ظاہر اور رہن سہن ہی اس کی ثقافت کی پہچان کرواتا ہے۔ ثقافت کسی بھی قوم کی بود و باش، رہن سہن کی عکاس ہونے کے ساتھ ساتھ اس قوم کو انفرادیت، پہچان اور بنیاد فراہم کرتی ہے۔

جس علاقے کی بود و باش کو اختر رضا سلیمی نے اپنے ناول میں بیان کیا وہ ہزارہ کی ثقافت ہے وہاں پر زیادہ تر لوگ ابھی بھی لکڑیاں بطور ایندھن استعمال کرتے ہیں اور برفباری اور سردیوں کے موسم میں زیادہ تر گھروں میں آتش دان جلاتے ہیں اسی آتش دان کا ذکر اختر رضا سلیمی نے ناول "جاگے ہیں خواب میں" یوں کیا ہے۔

> "جب وہ حویلی میں داخل ہوا تو حویلی میں صفائی ستھرائی کا کام مکمل ہو چکا تھا اور اس کے کمرے میں آتش دان شعلے اگل رہا تھا۔ وہ کچھ دیر آتش دان کے پاس بیٹھا آگ تاپتا رہا اور پھر نہانے اور کپڑے بدلنے غسل خانے چلا گیا جہاں نیم گرم پانی اس کے جسم سے مس ہونے کے لیے بے تاب تھا۔"(۱۳)

سردی زیادہ ہونے کی وجہ سے انہیں آگ جلانے کی ضرورت محسوس ہوتی اور وہ کھانے پکانے کے ساتھ ساتھ گھروں میں پیڑوں ہیڑوں کی جگہ آگ جلاتے ہیں اور آگ تاپتے ہیں زیادہ تر لوگوں کا رہن سہن اس کے ارد گرد کے ماحول کی وجہ سے ہی تخلیق ہوتا ہے۔ کیونکہ وہاں پر سردی زیادہ ہونے کی وجہ سے ان کو آگ جلانے اور آتش دانوں کی کثرت سے ضرورت ہے اس لیے یہ چیز ان کے رہن سہن کا بنیادی حصہ ہے جس کا ذکر اختر رضا سلیمی نے اپنے ناول میں کیا۔

گاؤں میں گھروں کو تعمیر کرنے کے لیے مختلف رسومات ہوتی جیسا کہ ناول "جندر" میں رسم پہوچھی کا ذکر ہے۔ لوگ مٹی کے گھر بناتے ہیں اور پھر گھروں کی مٹی سے لیپائی کرتے ہیں ان کے ہاں گھروں میں آتش دان بھی بنائے جاتے ہیں۔ تاکہ سردیوں کے موسم میں آسانی سے کمروں کو گرم کیا جاسکے اور ہاتھ تاپے جاسکیں۔ مختلف علاقوں میں شہری یا دیہاتی ہونے کی وجہ سے بھی رہن سہن الگ الگ ہوتا ہے ہر علاقے کا رہن سہن زیادہ تر ماحول کے مطابق ہوتا ہے مثلاً اگر کسی علاقے میں گیس کی سہولت موجود ہے تو وہاں کے لوگ لکڑیاں بطور ایندھن استعمال نہیں کرتے اگر وہاں الیکٹرک سٹی کی سہولت موجود ہے تو وہاں کی بود و باش کا حصہ مشعلیں اور لالٹین نظر نہیں آئیں گیں لیکن جس علاقے کی ثقافت کو اختر رضا سلیمی نے بیان کیا ہے

وہاں پر کوئی ایسی سہولیات موجود نہیں ہیں لوگ اپنی ضروریات زندگی کو پورا کرنے کے لیے مختلف طریقے استعمال کرتے ہیں اور وہی ان کے رہن سہن کا حصہ ہے۔ ناول "جاگے ہیں خواب میں" میں ایسی بنیادی ضروریات کا ذکر اختر رضا سلیمی نے یوں کیا ہے۔

> "گھروں کی لیپائی میں بھی وہ انہی پتوں کا باریک کترا استعمال کرتے تاکہ گارا پتھروں کے ساتھ آسانی سے چپک سکے۔ بطور ایندھن بھی زیادہ تر لکڑی چیڑ ہی کی استعمال کی جاتی۔ بہت پہلے جب لالٹین اور تیل سے جلنے والے لیمپ موجود نہیں تھے۔ بستی والے روشنی کے لیے بھی یا تو چیڑ کے تنے کے عین مرکز میں واقع سرخ رنگ کی لکڑ، جیسے وہ "دلی" کہتے ہیں، بطور مشعل استعمال کرتے، چیڑ کے جیگن کو مٹی کے پیالوں میں ڈال کر جلاتے۔"(۱۴)

اختر رضا سلیمی نے قدیم دور کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ وہ دور جب لالٹین بھی موجود نہیں تھی تو لوگ جیگن سے مشعلیں بناتے تھے۔ جیگن دلی کی لکڑی سے خاص مدت سے مادہ نکالتا تھا جسے وہ ذخیرہ کر لیتے تھے یعنی اس مشعل کے بعد بجلی کے دور سے پہلے تو وہاں پر لالٹیں اور مشعلیں جلائی جاتی تھیں۔ چونکہ وہ ایک پہاڑی علاقہ ہے اور وہاں چیڑ کی لکڑی کثرت سے پائی جاتی ہے اس لیے وہاں کے علاقے میں بسنے والے افراد بھی اس لکڑی کو کثرت سے استعمال کرتے ہیں۔ اس علاقے میں پہلے لوگ چیڑ کی مشعل رات کے تاریک اندھیروں کو گھروں کو روشن کرنے کے لیے استعمال کرتے تھے اور چیڑ کی لکڑی سے نکلنے والا لیس دار مادہ جسے ان کی زبان میں "جیگن" کہا جاتا ہے بھی استعمال کرتے تھے۔ وہ جیگن کو بطور مشعل بھی استعمال کرتے تھے اس کے علاوہ چیڑ کی لکڑی چونکہ وہاں بہت پائی جاتی ہے اس لیے وہاں یہ لکڑی بہت سے مقاصد کے لیے استعمال کی جاتی ہے جیسا کہ اختر رضا سلیمی نے اپنے ناول میں لکھا ہے:

> "موسم گرما خاص کر ساون کے دنوں میں صحن کے ایک کونے میں آگ جلا کر اس میں چیڑ کی سبز ٹہنیاں ڈال دی جاتیں، جو یک دم جلنے کے بجائے آہستہ آہستہ سلگتیں اور

فضا میں کڑوے دھویں کے مرغولے چھوڑتی رہتیں۔ یہ کڑوا دھواں صحن میں موجود
ڈینگی، مچھروں اور مکھیوں کو یا تو مار گراتا یا پھر انہیں بھاگنے پر مجبور کر دیتا۔"(۱۵)

موسم گرما میں چونکہ مچھر بہت زیادہ ہوتے ہیں جس کی وجہ سے بہت زیادہ بیماریاں لگنے کا خطرہ ہوتا ہے اور مکھیوں اور ڈینگی مچھروں کو بھگانے کے لیے بھی چیڑ کی ٹہنیاں گھروں میں سلگاتے ہیں اور یوں اس کا دھواں مکھیوں اور مچھروں کو بھگانے میں مدد دیتا ہے اور یوں وہ لوگ مختلف بیماریوں مثلاً ملیریا اور ڈینگی بخار سے بچ جاتے ہیں۔ چیڑ کا دھواں بہت زیادہ کڑوا ہوتا ہے۔ جس علاقے کا تذکرہ اختر رضا سلیمی نے اپنے ناول میں کیا ہے وہاں بارشیں زیادہ ہونے کی وجہ سے سبزہ بہت زیادہ ہوتا ہے اسی وجہ سے وہاں مچھر زیادہ ہوتا ہے اور گاؤں میں لوگ جب بیمار ہو جاتے ہیں اور وہ لوگ بمشکل اپنی ضروریات زندگی کو پورا کرتے ہیں اس لیے وہاں لوگ بیماریوں میں مختلف گھریلو دیسی ٹوٹکے اور دیسی ادویات ہی استعمال کرتے ہیں اور دوسری ادویات کے مقابل دیسی ٹوٹکوں کو ترجیح دیتے ہیں انہیں آزماتے ہیں اور ان پر یقین رکھتے ہیں جیسا کہ "جاگے ہیں خواب میں" اختر رضا سلیمی نے لکھا ہے:

"چلغوزے سے ملتا جلتا اس کا پھل سردیوں میں خاصے کی چیز سمجھا جاتا تھا علاقے کے
قدیم حکما و اطبا کا خیال تھا کہ تپ دق کے مریض کو اگر چیڑ کے درخت کے نیچے
لٹایا جائے یا اسے، اس کی سبز ٹہنیاں سونگھائی جائیں تو وہ جلد صحت یاب ہو جاتا
ہے۔"(۱۶)

اس علاقے میں کہا جاتا ہے کہ مریض کو چیڑ کے درخت کے نیچے لٹانے سے یا چیڑ کی ٹہنیاں سونگھانے سے وہ جلدی صحت یاب ہو جاتا ہے۔ اور اسی طرح کے کافی دیسی حربے آزمائے جاتے ہیں جس کو اختر رضا سلیمی نے اپنے ناول میں بیان کیا ہے۔

گاؤں میں لوگ بڑے بزرگوں کا بہت عزت و احترام کرتے ہیں اور ان کا ہر حکم بجالاتے ہیں اور بزرگوں کو ان کے ناموں سے پکارنے کے بجائے یا ان کو کسی رشتے کی مناسبت سے کم ہی پکارنے کے بجائے ان

کے لیے مخصوص الفاظ کا استعمال کرتے ہیں مثلاً بڑے سرکار، چھوٹے سرکار، مالک صاحب یا اس طرح کے الفاظ سے ان کو پکارتے ہیں یہ گاؤں کے عام ماحول میں بھی یہ بات دیکھائی دیتی ہے۔ گاؤں میں زیادہ تر لوگوں کو ان کے اصلی ناموں سے کم ہی پکارا جاتا ہے ان کے نام رکھ دیئے جاتے ہیں اسی طرح ان کی فطرت میں یہ بات شامل ہے۔ ہری پور ہزارہ میں بھی یوں ہی چھوٹوں کے ساتھ ساتھ بڑے بزرگوں کو بھی مختلف القابات یا عرف سے پکارا جاتا ہے۔ اور گاؤں والے انھیں اسی نام سے پہنچانتے ہیں۔ "جاگے ہیں خواب میں "ناول میں زمان کے والد کو سردار جی اور ان کے بیٹے کو جو ان کی اکلوتی اولاد تھی اس کا نام لینے کی بجائے اسے چھوٹے سر دار جی کہا کرتے تھے۔ "یہ لوگ اسے ہمیشہ چھوٹے سردار جی کہہ کر پکارتے اور اس کی تعظیم بجالاتے تھے۔ "(۱۷)

گاؤں میں ان کا رعب و دبدبہ اس لیے تھا کیونکہ انہوں نے گاؤں والوں کے لیے بہت زیادہ رفاعی کام کیے اس لیے لوگ ان کا بہت عزت و احترام کرتے تھے اور تعظیماً انہیں سر دار جی کہتے تھے۔ اور ان کی باتوں کو اپنے لیے حکم سمجھتے تھے۔ وہاں کے لوگ سر دار جی کے لیے ہمہ تن چشم انتظار رہتے تھے اور ان کی جان و مال کی حفاظت اپنے ذمہ فرض عین سمجھتے تھے۔

گاؤں میں ہر فرد دوسرے فرد کے معاشی مسائل کے ساتھ ساتھ گھریلو مسائل سے بھی آگاہ ہوتا ہے۔ ہر انسان انفرادی طور پر ایک دوسرے کو جانتا ہے کیونکہ وہاں پر رسمیں زیادہ تر ایسی ہوتی ہیں کہ ہر انسان دوسرے کے غم اور خوشی میں شریک ہوتا ہے اس لیے وہ ایک دوسرے کے خاندانوں کے حالات و واقعات سے واقف ہوتے ہیں۔ یہ گاؤں کی ثقافت کا حصہ ہے کہ ہر فرد دوسرے فرد سے جڑا ہوا نظر آتا ہے اور ایک دوسرے کو پہچانتا ہے۔ گاؤں کی ثقافت میں ہمیں پالتو جانور نظر آتے ہیں بلکہ یہ گاؤں کی ثقافت کا بنیادی حصہ ہے لوگ اپنی ضروریات زندگی پورا کرنے کے لیے مختلف جانور پالتے ہیں۔ چونکہ گائے اور بکری وغیرہ سے دودھ، دہی، مکھن اور گھی وغیرہ حاصل کیے جاتے ہیں اور لوگ انہیں بنیادی ضرورتوں کے پیش نظر جانور پالتے ہیں اور وہ ہمیں دیہات میں بالخصوص نظر آتے ہیں۔ اختر رضا سلیمی نے بھی ناول "جاگے ہیں خواب میں "اسی طرح کی بود و باش کو اس انداز میں بیان کیا ہے۔

"جہاں انہیں ہر لمحہ خوف کے سائے میں گزارنا پڑا، کہ یہ علاقہ ان کے آبائی گاؤں کے بہت قریب تھا اور ارد گرد کے تمام دیہاتوں کے لوگ انھیں پہچانتے تھے۔ گرفتار ہو جانے کا خطرہ سارا دن ان کے سر پر منڈلاتا رہا۔ جب بھی کوئی چرواہا بھیڑ بکریاں ہانکتا ہوا ان کے قریب سے گزرتا انھیں اس پر مخبر کا شائبہ ہوتا۔"(۱۸)

ہزارہ میں بھی دیہات کی ہی ثقافت نظر آتی ہے وہاں کے لوگ بھی جانور پالتے ہیں اور جانور سے مختلف فوائد حاصل کرتے ہیں وہاں کے ماحول میں جانور رکھنا گھر کی بنیادی ضرورت ہے اور ان کی بود و باش کا حصہ ہے وہاں گھروں میں بھیڑ بکریاں ریورڑوں کی صورت میں رکھے جاتے ہیں اور بنیادی ضروریات کے ساتھ ساتھ وہ جانوروں کو بطور ذریعہ معاش بھی استعمال کرتے ہیں۔

گاؤں کے رہن سہن میں خالصتاً یہی ماحول نظر آتا ہے۔ گاؤں میں زیادہ تر عورتیں گھروں میں مٹی کے برتن، کوزے، رکابیاں اور مٹی کی ہانڈیاں وغیرہ استعمال کرتی ہیں اور برتن صاف کرنے کے لیے بھی چیڑ کی کوچیاں استعمال کرتی تھیں ہیں۔ گاؤں کے لوگوں نے اپنی ضروریات زندگی کو مد نظر رکھتے ہوئے مٹی کے برتن پکانے کی بھٹیاں بنائیں اور برتنوں کو دیرپا اور پائیدار بنانے کے لیے مٹی کے برتن بنا کر انہیں بھٹی میں پکاتے۔ بھٹی کو آوی بھی کہا جاتا ہے وہاں گھڑے، پیالے، گل دان اور گھریلو استعمال کے لیے مختلف برتن پکائے جاتے ہیں اور یہ ثقافت ہمیں مخصوص علاقوں میں نظر آتی ہے جس علاقے کا ذکر اختر رضا سلیمی نے ناول میں کیا ہے وہاں بھی چیڑ کی کھال سے پکائے جانے والے برتنوں کو اہمیت دی جاتی ہے۔ برتن بنانے والے کمہار ایک خاص قبیلہ ہے جس کی سماجی حیثیت بہت پست ہوتی ہے لیکن موجودہ دور میں پنجاب میں بہت زیادہ لوگ اس پیشے سے منسلک ہیں۔ "جاگے ہیں خواب میں" ان کا ذکر یوں کیا ہے:

"کمہار چیڑ کی چھال سے مٹی کے برتن پکاتے۔ بستی میں اب بھی یہ روایت چلی آرہی ہے کہ چیڑ کی چھال کی آگ سے پکے ہوئے برتن زیادہ برکتیلے، خوش نما اور دیرپا ہوتے ہیں۔ عورتیں گھر میں برتن مانجنے کے لیے چیڑ کی کوچیاں استعمال کرتیں۔"(۱۹)

ہزارہ میں بھی کمہار طبقے کا ایک الگ مقام ہے اور اس علاقے میں یہ قبیلہ رہتا ہے اور اپنے فرائض بخوبی سرانجام دیتا ہے۔ ان کے ہاں بھی کچھ روایات ہیں جو ان کی بود و باش کا حصہ ہیں وہ بھی چیڑ کی کھال اکٹھی رکھتے ہیں اور چیڑ کی آگ سے پکائے ہوئے برتن کو زیادہ مضبوط سمجھا جاتا ہے اور اس کے علاوہ گھریلو خواتین برتنوں کو صاف کرنے کے لیے بھی چیڑ کی کو چیاں استعمال کرتی ہیں کیونکہ وہاں لوگ آگ جلاتے ہیں اور آگ پر ہی کھانے وغیرہ بھی بناتے ہیں جس سے برتن بہت زیادہ کالے ہو جاتے ہیں جن کو صاف شفاف کرنا آسان نہیں ہے اس لیے وہاں کی عورتوں کو برتن مانجھنے کے لیے خاصی محنت کرنی پڑتی ہے اور ان کے ہاں یہ خیال جاتا ہے کہ چیڑ کو چیاں سے برتن دیر تک چمکتے رہتے ہیں اور ان کی چمک برقرار رہتی ہے۔

گاؤں میں لوگ سادہ غذا استعمال کرتے ہیں۔ مرغن کی نسبت دیسی غذاؤں کو ترجیح دیتے ہیں مثلاً دیسی گھی، مرغے، مکھن اور گاؤں میں مکئی اور باجرے کی روٹیاں لسی کے ساتھ کھاتے ہیں۔ گاؤں میں مسالے دار مرغن غذاؤں کو پسند نہیں کیا جاتا۔ کیونکہ تمام لوگ ایک فعال اور صحت مند زندگی کے لیے مناسب دیسی غذائیں استعمال کرتے ہیں۔ "انھوں نے پوٹلی رکھی مکئی کی میٹھی روٹیاں نکالیں، انھیں کھایا۔"(۲۰)

گاؤں میں میٹھی روٹی بہت پسند کی جاتی ہے۔ لوگ اکثر موقعوں پر میٹھی روٹی بنا کر تقسیم کرتے ہیں۔ یہی چیز ہزارہ کی ثقافت میں نظر آتی ہے۔ ہزارہ میں چونکہ مکئی کی کاشت کثرت سے کی جاتی ہے اس لیے وہاں لوگ گندم کی روٹی کے علاوہ مکئی کی روٹیاں بھی پکاتے ہیں جن کو بہت پسند کیا جاتا ہے اور اکثر لوگ شوق سے کھاتے ہیں۔ گاؤں کے ماحول میں میلوں اور اکثر جانوروں کی لڑائی کے لیے باقاعدہ تقریب منعقد کی جاتی ہے اور لوگ اس میں ضرور شریک ہوتے ہیں اور اس سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ گاؤں کی ثقافت میں میلے ٹھیلے نظر آتے ہیں سال میں کچھ دن کسی خاص موسم میں مخصوص کیے جاتے ہیں اور پھر اس میلے کا افتتاح علاقے کے اثر و رسوخ والے معزز بزرگ کے ہاتھوں کروایا جاتا ہے۔ میلے میں عورتیں، مرد، بچے، بوڑھے تمام لوگ لطف اندوز ہوتے ہیں۔ ہری پور ہزارہ میں بھی گاؤں کی ثقافت نظر آتی ہے وہاں بھی یوں ہی گاؤں کے افراد اپنی تھکان دور کرنے کے لیے اور سب کو لطف اندوز کرنے کے لیے ایسے میلوں کا انعقاد کیا جاتا ہے جس کا ذکر

مصنف نے "جاگے ہیں خواب میں" یوں کیا ہے "بچپن میں وہ اپنے والد کے ساتھ عوامی میلے میں آیا کرتا تھا جس کا افتتاح کرنے وہ ہر سال اب بھی نور آباد آتے ہیں۔"(۲۱) گاؤں میں میلوں کا افتتاح بزرگوں سے کرواتے ہیں اور اسے برکت کی علامت سمجھا جاتا ہے۔

ناول کے مرکزی کردار زمان کے والد جن کا شمار علاقے کے معززین میں ہوتا ہے۔ انہوں نے میلے کا باقاعدہ افتتاح کیا اور یہی ان کے ہاں کئی سالوں سے روایت چلی آرہی ہے۔ میلا ان کے ماحول کا حصہ ہے اور وہاں کے لوگوں کے پاس بھی سیر و تفریح اور گندم و مکئی کی کٹائی اور بوائی بھی تھکاوٹ اتارنے کا واحد ذریعہ تھا جس کا وہ باقاعدگی سے انعقاد کرتے تھے۔

> "آج سے تقریباً پچاس برس پہلے تک، بستی والے، چیڑ کے درختوں کے بغیر، زندگی کا تصور تک نہیں کر سکتے تھے۔ بستی کے مکانوں کے ستون، کڑیاں، بالے، بلیاں، چوکھٹیں، کھڑکیاں، دروازے، الماریاں اور فرنیچر سب کا سب چیڑ کا ہوتا تھا۔ مکانوں کے چھت کی مٹی روکنے کے لیے بھی وہ چیڑ کے نوک دار باریک پتے، جنھیں پتوں کے بجائے تنکے کہنا زیادہ مناسب ہے، استعمال کرتے تھے۔"(۲۲)

ناول نگار نے ہزارہ کے پرانے دور کا نقشہ کھینچا ہے جب انسان کی ضروریات اس قدر زیادہ نہیں ہوتی تھیں۔ جینے کے لیے کھانا پینا اور رات گزارنے کے لیے کچھ ایسے اقدامات کیے جاتے تھے جن سے انھیں دن بھر کی تھکاوٹ اتارنی ہوتی تھی۔ ہزارہ میں چیڑ کے درخت کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ پرانے دور میں لوگ اپنی بستی میں چیڑ کے درختوں کے بغیر زندگی گزارنا مشکل سمجھتے تھے۔ چیڑ کے درخت کی لکڑی سے لے کر پتے تک کو مفید سمجھا جاتا تھا۔ مکان بنانے سے لے کر لکڑی جلانے تک کے کام آنے والا چیڑ کا درخت انمول سمجھا جاتا تھا۔ ہزارہ کے لوگوں نے اپنے ابتدائی بود و باش کے حوالے سے جنگل کی لکڑی اور ان کے پتوں کو استعمال میں لایا ہے۔

iii. رسوم وروایات

تہذیب وثقافت کے مظاہر میں ہر خطے کے رسوم رواج مختلف ہوتے ہیں۔ دُنیا میں مختلف علاقوں اور مختلف برادیوں کے رسوم و رواج ایک جیسے نہیں ہوتے۔ مختلف علاقوں، شہروں، دیہاتوں اور قصبوں کے لوگوں کی رسومات کی وجہ سے اس علاقے کی دلکشی اور خوبصورتی میں اضافہ ہوتا ہے۔ شادی بیاہ سے لے کر اموات تک مختلف قسم کی رسومات دیکھی جاتی ہیں اور ان کو ادا کرنے کے مخصوص طریقے رائج ہوتے ہیں۔ مختلف ایسی رسومات ہوتی ہیں جن کی مذہبی کوئی حیثیت نہیں ہوتی بلکہ وہ معاشرے کی تخلیق کردہ ہوتی ہیں اور ان رسومات کو قبول کرنا اس علاقے کا ہر فرد اپنے لیے لازم سمجھتا ہے۔

اور اکثر لوگ رسم ورواج کی طرف داری کرتے ہیں۔ وہ ان کے متعلق دلیلیں دیتے ہیں۔ ان کے لیے ان رسومات پر عمل کرنا کوئی معیوب عمل نہیں ہوتا۔ دراصل میں رسم رواج پر عمل کرنا اور وقت کے ساتھ ساتھ ان میں تبدیلی لانا بدل لینا اتنا ہی ضروری ہے جتنا ایک انسان کے لیے سانس لینا ضروری ہے لیکن ہر شخص یہ خیال کرتا ہے کہ ان کے رسم ورواج کو تبدیلی کی ضرورت نہیں۔ رسومات دراصل انسان کی اخلاقی اور معاشرتی اصلاح بھی کرتی ہیں کیونکہ یہ انسان کی ظاہری طریقہ زندگی کو فائدہ دیتی ہے۔ رسم و روایات ثقافت کا اہم حصہ ہوتی ہیں جو قوم میں احساسِ غرور پیدا کرتیں اور اسے نڈر اور بے باک بناتی ہیں اور اسے اپنی انفرادیت کا احساس ہوتا ہے۔ ہر خطے میں خوشی وغمی کی مختلف رسومات پائی جاتی ہیں اور لوگ ان رسومات کو کسی حیلے وحجت کے بغیر قبول کرتے ہیں بچے کی پیدائش پر ہونے والی رسومات عقیقہ، گھٹی پلانا، سوتک، قرآن سے نام نکالنا اور اس کے علاوہ شادی سے پہلے اور بعد میں ہونے والی رسومات ہر علاقے میں پائی جاتی ہیں۔ ناول نگار نے جس لوکیل میں یہ ناول لکھا اور اس کے ثقافتی عناصر کو ہمارے سامنے لائے وہاں بھی شادی سے پہلے باقاعدہ طور پر بڑے معززین مل کر لڑکی والے کے گھر جاتے ہیں۔ اور اس کا ہاتھ مانگتے اور کچھ علاقوں میں باقاعدہ منگنی کی تقریب کا اہتمام کرتے دونوں گھروں کے عزیز واقربا اکٹھے ہوتے اور اس رسم کو ادا کرتے ہیں

اس رسم میں عورت کو مرد سے منسوب کر دیا جاتا ہے۔ مختلف علاقوں میں گھر کے بزرگ ہی زیادہ تر لڑکی کے گھر رشتہ لینے کی غرض سے جاتے ہیں اسی رسم کا ذکر ناول نگار نے "جاگے ہیں خواب میں "یوں کیا ہے:

> "سردار جی! آپ کیسی باتیں کرتے ہیں۔ ہم آپ کے خادم ہیں۔ آپ سو مرتبہ ہمارے گھر آئیں لیکن کسی کام کے لیے کیوں آئیں۔ جب کام ہو تو ہم حاضر۔ آپ اگر رات کے پچھلے پہر بھی بلاتے تو میں سر کے بل حاضر ہوتا" حسن علی نے عاجزی سے کہا۔ "نہیں یہ بات نہیں ہے مجھے آنا چاہئے تھا۔ اس لیے مجھے معاف کرنا اور انکار نہ کرنا" حسن علی کے لہجے میں تجسس تھا۔ "میں تمہاری بیٹی کا ہاتھ مانگتا چاہتا ہوں سردار" سردار جی نے مدعا بیان کیا۔"(۲۳)

ہزارہ میں بھی بڑے بڑے بزرگ ہی لڑکی کے گھر جا کر باقاعدہ طور پر رشتہ مانگتے ہیں۔ حسن علی کی بیٹی کا رشتہ وہ اپنی اکلوتی اولاد ظفر علی خان کے لیے مانگنے جاتے ہیں حالانکہ وہ گاؤں کے سردار ہیں لیکن رسم کی ادائیگی کے لیے وہ اپنی شان و شوکت مرتبے سے بلند ہو کر زمیندار حسن علی کے گھر اپنے بیٹے کا رشتہ مانگنے جاتا ہے اور ان سے اجازت طلب کرتا ہے کہ وہ اس کی بیٹی کو بہو بنا کر گھر لے جائے۔

منگنی کے بعد ایک اہم رسم شادی ہے شادی میں نکاح مذہبی رسم ہے لیکن معاشرتی رسومات ایسی ہیں جن کو لوگوں نے اپنے لیے لازم و ملزوم ٹھہرا رکھا ہے۔ ان میں سب سے اہم رسم مائیوں کی رسم ہے۔ اکثر علاقوں میں لوگ مہندی کی رسم یعنی رسم حنا کو ترجیح دیتے لیکن ہری پور ہزارہ میں لوگ مائیوں کی رسم کو زیادہ اہم سمجھتے ہیں۔ مائیوں کی رسم کے حوالے سے سید احمد دہلوی نے اپنی لغت فرہنگ آصفیہ میں یوں لکھا ہے:

> "اس رسم کو مانجھے (پلنگ) بیٹھنا بھی کہتے ہیں۔ شادی کی رسومات میں سے خوبصورت رسم ہے جو شادی سے کچھ روز پہلے کی جاتی ہے جس میں دُلہے کو کپڑے پہنا کر چوکی پر بٹھاتے ہیں اور اُبٹن اس کے ہاتھ میں رکھتے ہیں۔ دُلہے کی بھابیاں اور بہنیں دُلہا کو بٹنا / اُبٹن لگاتی ہیں اور چھیڑ چھاڑ کرتی ہیں۔ شگن کے گیت گاتی ہیں۔ مائیوں کی تقریب سے شادی کی دیگر تقریبات کا باقاعدہ آغاز ہو جاتا ہے۔ دُلہن کو مائیوں نے بٹھانے کا

طریقہ قدرے مختلف ہے۔ دُلہن کو روز کپڑے پہنائے جاتے ہیں۔ مسند / چوکی پر بٹھایا جاتا ہے اور سہاگنیں / صاحب خاوند خواتین اُس کے ہاتھ پر اُبٹن رکھتی ہیں اور منہ میٹھا کرواتی ہیں۔ مائیوں کی رسم کے بعد دُلہن کا گھر سے باہر نکلنا بند کر دیا جاتا ہے۔ گھر کی ایک کوٹھڑی میں تنہا رکھتے ہیں تاکہ کوئی مرد اس کے پاس تک نہ جاسکے اور اس کا تصور دُلہا کی طرف بندھے۔ مائیوں قطعی ہندوستانی رسم ہے۔"(۲۴)

شادی سے پہلے اس رسم کا انعقاد کیا جاتا ہے اس میں تمام عزیز و اقارب جمع ہوتے ہیں لڑکیاں گیت گاتی ہیں اور دُلہا کو اُبٹن لگاتی ہیں۔ لڑکی کے ہاں بھی یوں ہی گیت گائے جاتے ہیں اور لڑکی کو اُبٹن لگایا جاتا ہے۔ ہری پور ہزارہ میں بھی اس رسم کو یوں ہی ادا کیا جاتا ہے اس رسم کو دونوں ہی اہمیت دیتے ہیں۔ اختر رضا سلیمی نے ناول میں اس رسم کا ذکر یوں کیا ہے "ظفر علی خان جو ان کی امیدوں کا واحد سہارا تھا، آج اس کی مائیوں کی رات تھی کل وہ حسن علی کی بیٹی صابرہ خانم کو اپنی بہو بنا کر لے آئیں گے۔ وہ پچھلے چھ سات سالوں سے اپنے بیٹے کی شادی کا خواب دیکھ رہے تھے۔"(۲۵) ہر شخص جس کی بیٹی جوان ہو وہ چاہتا ہے کہ وہ اسے اپنا گھر کا ہوتا دیکھے اور چونکہ ہمارے معاشرے میں رواج ہے کہ بیٹی کے جوان ہوتے ہی اس کے رشتے کے بارے میں سوچا جاتا ہے صابرہ خانم کے باپ نے بھی اپنی بیٹی کے بارے میں یہی خواب دیکھا جس کا تذکرہ ناول میں مصنف نے کیا۔

مختلف خطوں میں شادی کی تاریخ منگنی والے دن ہی طے کر دی جاتی ہے۔ سندھ کے علاقے میں منگنی کے بعد منگنی اور شادی کے درمیان کم از کم تین عیدوں کا وقفہ ضروری سمجھا جاتا ہے۔ شادی سے ایک یا دو دن پہلے مائنیوں کی رسم ہوتی ہے اور اس کے بعد رخصتی کی رسم ادا کی جاتی ہے۔ شادی کی محفل میں عزیز و اقارب مردوں اور عورتیں ایک ہی جگہ کا انتظام کرتے ہیں اور نکاح کی رسم کے بعد دلہن کی رخصتی کی تیاریاں کی جاتی ہیں۔ شادی سے دو لوگوں کے ساتھ دو خاندانوں کا تعلق بھی قائم ہو جاتا ہے انہیں رسومات کا ذکر ناول میں کیا

گیا ہے۔ ہزارہ میں بھی مائیوں کی رسم کی جاتی ہے لیکن اس کا دورانیہ ایک دن کا ہوتا ہے۔ مختلف لوگ اس رسم کے حوالے سے ساتھ اور بہت سی رسمیں جوڑ لیتے ہیں لیکن ہزارہ میں صرف یہی رسم ادا کی جاتی ہے۔

موت ایک برحق عمل ہے او کسی چیز کو بھی دوام حاصل نہیں اس فانی دنیا میں ہر چیز عارضی ہے اور یونہی انسانی زندگی کو بھی دوام حاصل نہیں موت کا ذائقہ ہری ذی روح نے چکھنا ہے انسان کے مرنے کے بعد متعدد مذہبی رسومات ادا کی جاتی ہیں ان میں مرنے کے بعد غسل دینا، کفن پہنانا اور قبر اور دفن کرنا یہ تمام مذہبی رسومات ہیں اس کے ساتھ ساتھ کئی علاقوں کی ایسی رسومات ہوتی ہیں جو سراسر علاقائی ہوتی ہیں مثلاً کئی علاقوں میں مرنے کے بعد میت والے گھر کے تمام انتظامات کفن و دفن کے تمام اخراجات اہل علاقہ ادا کرتے ہیں۔ کئی علاقوں میں میت کو دفنانے کے لیے صرف علاقائی قبرستان کا ہی انتخاب کیا جاتا ہے۔ ہری پور ہزارہ میں کسی فرد کے مر جانے کے بعد اس کی قبر کے لیے تختے صرف کاہو بزرگ ترین درخت سے ہی لیے جاتے ہیں۔ اور تمام اہلِ علاقہ اس روایت کی خلاف ورزی نہیں کرتے اور اس روایت کو فرض عین سمجھتے ہیں مرنے والے کے عزیز رشتہ دار اس بات کا خاص خیال رکھتے ہیں کہ تختے بزرگ ترین درخت کے ہی ہونے چاہئیے۔ "جاگے ہیں خواب میں" اس روایت کا تذکرہ اختر رضا سلیمی نے یوں کیا ہے "اس کی موت کی صورت میں، اس کی قبر کے تختے اس وادی کے بزرگ ترین کاہو کے تنے ہی سے نکالے جائیں گے، یہی ہماری صدیوں سے روایت رہی ہے اور میرے جیتے جی یہ روایت نہیں ٹوٹ سکتی۔" (۲۶)

ناول میں اس رسم کے حوالے سے ذکر کرتے ہوئے ناول نگار نے بتایا کہ یہ رسم صدیوں پرانی ہے اور لوگ اس روایت پر عمل کرتے ہیں اور کاہو کی لکڑی سے ہی تختے نکالتے ہیں۔ مختلف علاقوں میں سیمنٹ کی پیڑیاں وغیرہ رکھی جاتی ہیں۔ اس کے علاوہ قبر کی خوبصورتی سے آرائش وزیبائش کی جاتی ہے اور اس کو سیمنٹ سے مضبوط بنوایا جاتا ہے۔ زیادہ تر لوگ قبر کو خوبصورت ٹائل وغیرہ سے تیار کرواتے ہیں۔ ہری پور میں بھی قبر کو یوں ہی تیار کروایا جاتا ہے تاکہ مرنے والے کی یاد تازہ رہے اور قبر خراب ہونے کا اندیشہ بھی نہ ہو۔ زیادہ تر لوگ قبر پر مرنے والے کے نام کی تختی لگواتے ہیں تاکہ یہ یاد دہانی رہے کہ کون سی قبر کس کی ہے۔

اس روایت کا تذکرہ اختر رضا سلیمی نے ناول "جاگے ہیں خواب میں" میں یوں کیا ہے "ان کی نظر سنگ مرمر سے بنی ایک بڑی قبر کے سرہانے لگی تختی پر پڑی۔ اس سے آگے سبز گنبد والا ایک مزار تھا۔ جس کی چھت پر کبوتر بیٹھے ہوئے تھے۔"(۲۷) وہاں بھی لوگ قبر کو باقاعدہ سنگ مرمر کے پتھر سے تیار کرواتے ہیں اور اس پر مرنے والے کے نام کی تختی لگائی جاتی ہے اور بزرگوں کی قبروں پر باقاعدہ گنبد وغیرہ بنوائے جاتے ہیں جو ان کی رسومات میں نظر آتا ہے۔ قبر بنانا مذہبی رسم ہے لیکن اس کی آرائش وزیبائش معاشرتی رسم ہے جس کو ہزارہ کے لوگ بھی مانتے ہیں اور اس پر عمل کرتے ہیں۔ اختر رضا سلیمی نے بھی اس رسم کی وضاحت ناول میں کی ہے۔

> "رات کا باقی حصہ وہاں موجود ایک مزار کے احاطے میں گزارا جو بستی کے عین وسط میں واقع تھا اس بستی کا نام نور پور شاہان تھا۔ صبح اٹھ کر انھوں نے یہ سوچ کر یہیں قیام کرنے کا ارادہ کر لیا کہ جب تک انھیں کوئی کام وام نہیں ملتا خانقاہ کے لنگر سے گزارا چلتا رہے گا"(۲۸)

اسلامی معاشرے میں اولیائے کرام کو خاص مقام حاصل ہے۔ اولیائے کرام اور بزرگان دین کو مذہب کے ساتھ ساتھ علاقائی لحاظ سے خاصی اہمیت حاصل ہے۔ ان کے ادب واحترام کے ساتھ ساتھ ان کی قبروں کا بھی احترام کیا جاتا ہے۔ بایں ہمہ وہاں کچھ پہر دار متولی جو اپنی مرضی سے وہاں کام کرتے ہیں اور اس کی حفاظت کرتے ہیں۔ بزرگوں کی قبروں پر مقبرہ بناتے ہیں اور ان کے مزاروں پر لنگر کا بھی بلاناغہ انتظام کیا جاتا ہے۔ ناول نگار نے جس علاقے کی رسوم و روایات کا ذکر کیا ہے وہاں بھی خانقاہیں موجود ہیں اور ان خانقاہوں کے عقیدت مند وہاں اپنی توفیق کے مطابق فی سبیل اللہ خدمت کرتے ہیں، ان سے عقیدت رکھتے ہیں اور وہاں لنگر تقسیم کرتے ہیں جس کا تذکرہ اختر رضا سلیمی نے ناول میں درج بالا اقتباس میں کیا ہے۔

عقیدت مند ہر سال عرس مناتے ہیں اور اس میں دور دراز علاقوں سے لوگ شرکت ہیں اور کچھ منتوں کے طور پر مختلف چیزیں مثلاً چادریں چڑھانا، پیسے دینا، دیگیں چڑھاتے ہیں اور اکثر لوگ گروہوں کی

صورت چل کر آتے ہیں۔ ہری پور ہزارہ میں بھی مزاروں پر عقیدت مند اسی طرح اپنی عقیدت کا اظہار کرتے ہیں جس کا ذکر ناول میں اختر رضا سلیمی نے یوں کیا ہے:

> "سردار جعفر خان کی اولاد اب بھی مزار کی دیکھ بھال کر رہی ہے اور ہر سال ان کا عرس بھی منعقد کرواتی ہے، جس میں دوردراز سے لوگ ڈالیاں لے کر حاضر ہوتے ہیں۔"(۲۹)

وہاں لوگ گروہوں کی صورت میں جمع ہوتے ہیں اور کوئی مخصوص چیز مثلاً دیگ یا چادر وغیرہ لے کر آتے ہیں اسے آکر مزار پر نذرانے کی صورت دیتے ہیں اسے ڈالی کہا جاتا ہے۔ مختلف علاقوں سے لوگ مختلف ڈالیاں لے کر آتے ہیں اور حاضری دیتے ہیں۔ اپنی منتیں مانگتے ہیں۔ مزاروں پر عقیدت مند فی سبیل اللہ لنگر بانٹتے ہیں وہ تمام اخراجات مزار پر کام کرنے والا عقیدت مند برداشت کرتے ہیں۔ زیادہ تر دور دراز سے آنے والے مسافر جن کے قیام وطعام کا بندوبست کرنے والے کوئی نہیں ہوتا وہ زیادہ تر خانقاہوں پر رہتے ہیں اور اپنے مقاصد حاصل کرنے کے بعد چلے جاتے ہیں مزاروں پر ایسے لوگوں کی بھی بھرمار نظر آتی ہے۔ اختر رضا سلیمی نے بھی اپنے ناول میں ایسی ہی روایت کا ذکر کیا ہے۔

iv. علوم وفنون

عموماً کسی بھی قوم کا ثقافتی ورثا اس علاقے کے انداز واطوار اور طرزِ زندگی کی طرح ہی ہوتا ہے۔ جو انھوں نے صدیوں سے اپنایا ہوتا ہے۔ اس میں رہن سہن، کھانا، پینا اور اوڑھنا، پہننا سب ہی شامل ہوتا ہے۔ اس ورثے میں تمام عوامل ہی شامل ہوتے ہیں۔ یہاں تک کہ اچھائی اور برائی کی تمیز بھی اسی میں شامل ہے۔ اس میں وہ تمام انداز واطوار بھی شامل ہوتے ہیں۔ جو انہوں نے اظہار کے لی اپنائے ہوتے ہیں۔ جس میں رقص، موسیقی، نغمہ، شاعری اور ڈرامہ وغیرہ شامل ہیں۔ انسانی زندگی میں سب سے اہم حصہ ثقافت

ہے۔اور ہر شے کی اپنی ثقافت ہوتی ہے۔ لیکن کچھ ایسی چیزیں جو ثقافتی اظہار کے لیے بنائی جاتی ہیں اور وہ ثقافت کی بہتر انداز میں نمائندگی کرتی ہیں۔

تمام خارجی مسائل کا حل ہوتا ہے ان کو سائنسی مدد سے یا ذہنی مدد سے حل کیا جاسکتا ہے۔اور ان مسائل کا اظہار بھی مختلف انداز ہوتا ہے۔ مثلا اگر کوئی مشین خراب ہو جائے تو کوئی میکینک اس کا بہتر حل بتاسکتا ہے یا اس کو سمجھایا جاسکتا ہے۔ لیکن خارجی جذبات کے اظہار کے لیے آنکھ سے بہتر کوئی وسیلہ نہیں ہوتا۔اور انسانی جذبات کی ترجمانی جس انداز میں آنکھ کر سکتی ہے کوئی اور آلہ نہیں کر سکتا۔اسی طرح جب ہم کسی قوم کو جاننے یا پرکھنے کی کوشش کرتے ہیں تو ثقافتی ورثے میں علوم وفنون کے علاوہ اس کا بہتر انداز میں اظہار کوئی نہیں کر سکتا ہے۔سید امجد علی نے بھی اپنے مضامین میں اس خیال کا اظہار کچھ یوں کیا ہے:

> "جس طرح جسم کے دوسرے حصوں کے مقابلے میں آنکھ داخلی جذبات کا سب سے موثر طریقے پر اظہار کرتی ہے۔ اسی طرح فنون اور دستکاریاں کسی قوم کے چہرے کو جان دار ابلاغی بناتے ہیں اور ان کے بغیر قومی چہرہ سپاٹ اور بے حس ہو جاتا ہے۔"(۳۰)

انسان ماحول کے مطابق زندگی گزارتا ہے۔ معاشرے میں رونما ہونے والے معاملات کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔ معاشرے کی سفاکی اور بے حسی کو دیکھ کر اجسام تو شل ہوتے ہیں۔ لیکن زیادہ احساس آنکھ کو ہوتا ہے کیونکہ یہ داخلی اعتبار سے موثر اظہار کرتی ہے۔ مختلف فنون اور ستکاری کی حوصلہ افزائی کسی بھی قوم کی پہچان کو واضح کرنے میں بہت مددگار ثابت ہوتی ہے۔ اور قوم کی پہچان ابلاغ کے ذریعے ہی بہتر انداز سے کی جاسکتی ہے۔ مندرجہ بالا اقتباس سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ رسوم ورواج اور دستکاریوں میں ایک کشش ہی اس معاشرے کی پہچان کرا سکتی ہے۔

علوم وفنون اور دستکاریوں کے بغیر کسی قوم کی ثقافت کو جاننا نا ممکن ہے۔ "جاگے ہیں خواب ہیں" ناول میں بھی اختر رضا سلیمی نے اس قوم کے فنون کو اس انداز میں بیان کیا ہے کہ ان کی ثقافت کو جاننا اور پرکھنا قدرے آسان ہو گیا اور وہاں کے فنون کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

"اس سفید دیوار میں جو چیز سب سے نمایاں تھی وہ لکڑی کے دو دروازے تھے۔ دائیں طرف والا دروزہ بڑا اور دو پٹوں والا جب کہ بائیں طرف والا چھوٹا اور ایک پٹ والا تھا۔ دونوں دروازے بند تھے۔ اس نے دونوں دروازوں کو غور سے دیکھتے ہوئے اندازہ لگایا کہ بڑے دروازے کے پٹ، اندر کی طرف، جب کہ چھوٹے کے، باہر کی طرف کھلتے ہیں۔ اس نے اپنے دائیں، بائیں دیکھا دونوں طرف سفید دیواریں تھی۔ جن پر انسانی ڈھانچوں کی عجیب و غریب تصویریں ٹنگی ہوئی تھیں۔"(۳۱)

ناول نگار نے ناول میں فنون کے حوالے سے ایک گھر کے اندر کا نقشہ کھینچا ہے۔ پرانے دور میں بھی لوگ لکڑی کے دروازے استعمال کرتے تھے اور وہ دروازے دو پٹوں پہ مشتمل ہوتے تھے۔ اسی طرح چھوٹے دروازوں میں ایک پٹ والا بھی دروازہ ہوتا تھا جس بعض اوقات کچن یا سٹور کے لیے استعمال ہوتا تھا اور بڑا دو پٹ والا دروازہ بڑے کمروں کے لیے ہوتے تھے۔ ناول نگار نے بھی ایک کمرے کی تصویر کشی کی اس کی دیواریں سفید تھیں۔ جن پر انسانی ڈھانچوں کی تصاویر آویزاں تھیں۔

سنگ تراشی، مجسمہ سازی، تصویر کشی اور مختلف نقش و نگار پر مشتمل کندہ کاری علوم و فنون میں آتے ہے۔ قدیم دور میں مختلف تہذیبوں نے علوم و فنون پر دسترس رکھی اور ایک مکمل تہذیب کے لیے فنون کی ترقی کے لی اقدم کیے۔ ہاتھوں سے تصویریں بنانے کا فن بھی قدیم دور کے ساتھ ساتھ جدید دور میں بھی مقبول ہے۔ قدیم دور میں گھروں اور بازاروں کے اندر نقش و نگار اور ہاتھوں سے بنی ہوئی تصویریں کثرت سے ہوتی تھیں۔ ناول نگار بھی اپنے ناول میں ہاتھوں سے بنی ہوئی تصاویر کے بارے میں لکھتے ہیں: "یہ ہاتھ کی بنی ہوئی خیالی تصویر تھی اور اس کے خدوخال نور خان کی جلالت کے ساتھ ساتھ بنانے والے کی مہارت کا پتا دے رہے تھے۔"(۳۲) ناول نگار اپنے ناول "جاگے ہیں خواب میں" میں ہاتھ سے بنی ہوئی تصویر کے حوالے سے کہتے ہیں نور خان کی خیالی تصویر بھی نور خان کی شخصیت کے اعتبار سے بالکل حقیقی تصویر لگتی ہے۔ تصویر بنانے والے

کی مہارت بھی نظر آتی ہے کہ اس نے نور خان کی تاریخ پڑھ کر اس کی شخصیت کے مطابق اس کی تصویر بنا دی۔

ہاتھ سے بنائی جانے والی اشیاء ہی در حقیقت ایک قوم کی تہذیب کا پتا دیتی ہیں۔ اس ناول میں بھی اختر رضا سلیمی نے بتایا ہے کہ وہ فن کے اس قدر ماہر تھے کہ خیالی تصویر میں نور خان کے خدوخال اس قدر خوب صورتی سے بنائے گئے تھے کہ وہ اس علاقے میں فن کی ثقافت کے حوالے سے مہارت میں آگے تھے۔ مصوری کا پیشہ اس دور کی ثقافت کا حصہ تھا۔ ہاتھ سے بنائی جانے والی تصاویر ایک عظیم شاہکار سمجھی جاتی تھیں۔ دست کاری سے مراد ہاتھ سے بنائی جانے والی اشیاء ہیں۔ دست کاری فن سے زیادہ ثقافت کا پتا بھی دیتی ہے۔ تو فنون ثقافت کا اعلیٰ ترین اظہار اس انداز میں نہیں کر سکتے جس طرح دست کاریاں کر سکتی ہیں۔ دستکاری حقیقت میں صرف ایک علاقے کا نہیں بلکہ پوری قوم کا پتا دیتی ہے۔ دست کاری میں ثقافتی نمونوں کی تخلیق اور تخلیق نو کی جاتی ہے اور یہ تبدیلی کا عمل زیادہ تر نامونوس ہوتا ہے۔ سید امجد علی نے اپنے مضمون "دستکاری کی ثقافتی اہمیت" میں علوم و فنون کے حوالے سے بحث کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

> "اپنی اصلی صورت میں دست کاری پوری قوم کا اظہار کرتی ہے۔ پاکستان میں بنایا جانے والا مٹی کا پیالہ صدیوں سے بنایا جارہا ہے۔ لکڑی اور پتھر پر کی جانے والی نقاشی کو ان گنت لوگوں نے صدیوں کے عمل کے ذریعے تشکیل دیا ہے۔"(۳۳)

دست کاری در حقیقت ذریعہ اظہار ہے اور ثقافت کی وضاحت کرتی ہے۔ دست کاری فنون لطیفہ سے زیادہ بہتر اور موثر انداز میں نمائندگی کرتی ہے۔ ایک پینٹگ اسے بنائے جانے والے مصور کے ذاتی اظہار کا اعلیٰ نمونہ ہوتی ہے۔ ثقافتی عناصر کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ در حقیقت ثقافت ہی کسی علاقے کی نمائندگی کا بہترین حصہ ہے۔

ایک پینٹنگ اُسے بنائے جانے والے مصور کے ذاتی اظہار کا اعلیٰ نمونہ ہوتی ہے۔ اسی طرح ظروف، لکڑی پر کی جانے والی کندہ کاری، ہاتھوں سے بنائے جانے والی لکڑی کی نقشِ نگاری اور کشیدہ کاری حقیقت میں

کسی قوم کے ذہنی اور فکری صلاحیتوں سے روشناس کرانے کے ساتھ ساتھ اس قوم کی ثقافت کی تصویریں بھی دکھاتی ہے۔ "جاگے ہیں خواب میں" ناول میں بھی اختر رضا سلیمی نے اس معاشرے کی ثقافتی تصاویر دکھانے کی کوشش کی ہے:

> "لکڑی کا ایک خوبصورت ستون تھا جو کمرے کے عین وسط میں ایک خوبصورت تراشیدہ پتھر پر ایستادہ تھا جس کا سر چھت کے دو بڑے شہتیروں کا مقام اتصال تھا۔ ستوں پر بنے نقش نگار بنانے والے کی محنت، مہارت اور ذوق کا پتہ دے رہے تھے۔"(۳۴)

ان کے ہاں لکڑی، ہاتھ سے تراشے ہوئے پتھر دار دیواروں پر بنے نقش و نگار نظر آتے ہیں جو اپنے معیار کے مطابق اپنی ثقافت کی نمائندگی کر رہے ہوتے ہیں۔ اس علاقے کی خاص بات یہ ہے وہاں ہاتھ سے بنائی جانے والی اشیاء کو زیادہ پسند کیا جاتا ہے اور یہی اس علاقے کی ثقافت ہے۔ دیوار پر بنائے جانے والے نقش نگار اور ہاتھ سے بنی ہوئی اشیاء کثرت سے نظر آتی ہیں "جنگجوؤں میں ایسی نفاست اور ایسا ذوق آرائش؟۔۔۔۔ انھوں نے لکڑی پر کیے گئے نقاشی کے باریک اور نفیس کام کو دیکھتے ہوئے سوچا۔"(۳۵) دنیا میں موجود تمام دست کاریوں میں کڑھائیاں، موتی ستارے، ہاتھوں سے بنانے جانے والے زیوارت ان کی ذہنی صلاحیتوں کو بیان کرتے ہیں اور عوام کے ذوق کے اظہار کا ذریعہ ہیں۔ وہیں ہمارے سامنے انتہائی نفیس اور گنجلک دست کاریاں بھی آتی ہیں جنہیں امراء و شرفاء شہری لوگ اپنے گھروں میں اور بادشاہ اپنے درباروں، مزاروں وغیرہ کے اندر بنوایا کرتے ہیں۔ اور یہ بھی محنت کے ساتھ ساتھ اس علاقے کی ثقافت اور ذوق سے آگاہ کرتے ہیں اور وہاں کے لوگوں کے طرز زندگی کے انداز بھی نظر آتے ہیں۔ ناول میں ہاتھ سے بنی ہوئی چیزوں کی تصاویر کی کثرت سے آویزی نظر آتی ہے جن کا تذکرہ ناول میں ناول نگار نے بہت سی جگہوں پر کیا ہے۔

ج: اعتقادی مآخذ کے ثقافتی عناصر

i. مذہبی رسومات

مذہب کا ہماری زندگی سے گہرا اور ہمہ گیر تعلق ہے۔ تاریخ پر نظر دوڑائی جائے تو انسان کی بود و باش، رہن سہن معاشی اور معاشرتی پہلوؤں میں مذہب کی واضح جھلک دکھائی دیتی ہے۔ اور ہر عمل میں ایک واضح فرق نظر آتا ہے اور وہ یہ کہ ہر انسان کا کسی نہ کسی ہستی کو برگزیدہ مان کر ان کے حضور سر بسجود ہونا اور اسے اپنا حاجت روا نجات دہندہ سمجھتا ہے اس کرہ ارض پر شاید ہی کوئی ایسا شہر ہو گا جس پر کوئی مندر کلیسا یا مسجد موجود نہ ہو یا کوئی انسان کسی کے حضور منتیں نہ مانتے ہوں یا دعائیں نہ کرتے ہوں۔ لوگوں کے اسی طرز عمل کا نام مذہب ہے۔ جس طرح ادب کی حتمی کوئی تعریف ابھی تک سامنے نہیں آئی اسی طرح مذہب کی بھی کوئی جامع ومانع تعریف ممکن نہیں ہے۔

مذہب کے لیے انگریزی میں Religion کا لفظ آتا ہے جس کا مفہوم پوجا پاٹ یا عقیدے کا نظام ہے۔ پوجا پاٹ کے لیے کسی ٹھوس ہستی کا ہونا ضروری نہیں ہے۔ اور تمام مذاہب کا مقصد پوجا پاٹ ہو یہ لازم نہیں ہے بلکہ زیادہ تر مذاہب پوری زندگی کا احاطہ کرتے ہیں جس طرح محمد دینی ابراہیمی کے لیے مذہب کا لفظ استعمال کیا ہے جس کے معنی مکمل ضابطہ حیات ہیں گویا اس میں بھی محض عبادت کے طور طریقے یا رسومات ہی نہیں بلکہ اس کے اندر وہ تمام اقدار روایات بھی شامل ہیں جن میں عقیدہ، طرز معاشرت، عبادت، سیاست، بود و باش، رسوم و رواج، زندگی کے مادی و غیر مادی، روحانی اور ثقافتی تمام امور شامل ہیں۔ مذہب کی تعریف مختلف لغات میں کی گئی ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے قومی انگریزی اُردو لغت میں اس کی تعریف کچھ یوں کی ہے۔

> "مذہب سے مراد، دھرم، عقیدہ، راستہ یا کسی انسان کے لی بااختیار تسلیم کرنے کا عمل ہے۔ اس قسم کی مختار قوت کو تسلیم کرنے والوں کا یہ احساس یا روحانی رویہ اور اس کا ان کی زندگی اور طرزِ زیست سے اظہار متبرک یا مقدس رسوم و رواج یا اعمال کے سرانجام

دیئے جانے کا عمل اعلیٰ ترین ہستی (خدائے واحد و مطلق یا ایک سے زیادہ دیوتاؤں پر ایمان لانے اور ان کی عبادت کا ایک مخصوص نظام کسی مذہبی تنظیم یا فرقے کے ارکان کا طرزِ زندگی (کسی بھی چیز سے) وفاداری اور باضمیر ہونے کا عمل۔"(۳۶)

مختلف لغات میں تصریحات کی تعریف مختلف ہیں۔ علاوہ ازیں تاریخ انسانی پر نظر دوڑائی جائے تو ہمیں شاید ہی زمین کا کوئی ایسا خطہ نظر آئے گا جس میں ان کی زندگی کے عام اور خاص دونوں معاملات میں مذہب کا عمل دخل نہ ہو اور مذہب عقل انسانی کو ورطۂ حیرت میں ڈالنے کے لیے ناکافی ہو۔ دُنیا میں رواج پانے والی تمام رسومات خواہ وہ شادی بیاہ کی تقریبات ہوں، معاشرتی اقدار، جینا، مرنا، غم و خوشی کی عرض تمام رسومات و روایات مذہبی طریقے سے ہی سرانجام دی جاتی ہیں۔

برصغیر پاک و ہند کا معاشرہ ایک ایسا معاشرہ ہے جو مذہبی روایات و رسومات کا پابند ہے۔ زندگی کے کسی بھی شعبے سے رسم کیوں نہ ہو قرآن و سنت کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے طرزِ زندگی کی تمام رسومات و روایات ادا کی جاتی ہیں۔ اسی طرح اسلامی معاشرے میں مولوی کی اہمیت و کردار کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ مولوی اسلامی رسم و رواج کو ادا کرنے کا بنیادی ذریعہ ہے۔ بنیادی تعلیم حاصل کرنا اسلامی معاشرے کی ایک اہم صفت ہے۔ ہمارے معاشرے میں لڑکیوں کی دنیاوی تعلیم سے زیادہ دینی تعلیم پر زیادہ زور دیا جاتا ہے۔ ہزارہ میں بھی زیادہ زور قرآن شریف پڑھانے پر دیا جاتا ہے۔ یہ رواج پا جانے والی اہم رسم ہے۔ اختر رضا سلیمی اپنے ناول میں اس مذہبی رسم کے حوالے سے یوں لکھتے ہیں۔ "لڑکیاں کہاں سکول جاتیں ہیں پتر۔ اور وہ بھی انگریزی سکول میں ۔ لڑکیاں تو بس قرآن شریف پڑھتی ہیں۔ جو مولوی صاحب نے تجھے پڑھا دیا ہے۔"(۳۷) لوگ اپنے لڑکوں اور خاص طور پر لڑکیوں کو بھی مولوی صاحب کے پاس قرآن شریف کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے بھیجتے ہیں۔ اور دینی تعلیم کو اولین ترجیح دی جاتی ہے۔ دنیاوی تعلیم کو اس حد تک اہمیت حاصل نہیں ہے جس طرح دینی تعلیم کو لازم اپنے بچوں کو دلوائی جاتی ہے۔

اسلامی معاشرے میں ہونے والی ہر خوشی و غم کی تقریب میں مولوی کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ شادی بیاہ میں ہونے والی نکاح کی رسم، مسجد اور مدرسہ میں دی جانے والی ابتدائی تعلیم اور قرآن پاک کی تعلیم، نمازِ جنازہ کی امامت، اور ہر نماز کی امامت کے لیے امام کی حیثیت مرکزی ہے۔ تمام رسومات مکمل مذہبی طریقے سے ادا کرنے کے لیے امام کا کردار خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ تمام رسومات کی ادائیگی کے ساتھ ساتھ پنجگانہ نماز کی امامت کے لیے بھی امام صاحب کو ہی منتخب کیا ہے۔ نماز کا ذکر قرآن پاک میں بھی ہے۔ اور اسی طرح نماز کی فضیلت و اہمیت کے حوالے سے قرآن کریم میں ہے "(اور) وہ جو نماز قائم کرتے ہیں اور جو مال ہم نے انھیں دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔" [۳۸] نماز کا ذکر قرآن پاک میں متعدد دفعہ آیا ہے اور نماز اسلامی معاشرے کی بنیادی مذہبی رسم ہے جو روزانہ پانچ وقت ادا کی جاتی ہے اور نماز باجماعت ادا کرنا فرض ہے اس فرض کو ادا کرنے کا اجر بھی بہت زیادہ ہے اور فرض کے غفلت برتنے کی سزا بھی بہت زیادہ ہے۔

نماز کی ادائیگی سے پہلے وضو کیا جاتا ہے۔ مذہب اسلام میں طہارت و پاکیزگی کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ مذہب میں طہارت کے معنی ظاہری اور باطنی صفائی ہے۔ تیمم یا وضو کے بغیر پڑھی جانے والی نماز باطل ہوتی ہے۔ یعنی پاک صاف ہو کر پاک صاف جگہ پر ہی نماز ادا کی جاتی ہے۔ اختر رضا سلیمی نے وضو اور نماز جیسے فرض کی ادائیگی کو اپنے ناول "جاگے ہیں خواب میں" میں یوں بیان کیا ہے:

> "دریا پر پہنچ کر انھوں نے پہلے جی بھر کر پانی پیا۔ وضو کر کے سب لوگ دریا کنارے ایک ہموار جگہ پر جمع ہو گئے۔ پھر دو مختلف صفیں ترتیب دی گئیں۔ پہلے ایک صف میں امام کے پیچھے آ کھڑی ہوئی اور دوسری پہرہ دیتی رہی۔ جب پہلی رکعت ختم ہوئی تو وہ صف پیچھے ہٹ گئی اور پہرہ دینے لگی۔۔۔ اسی ترتیب سے انھوں نے باجماعت نماز ادا کی۔"[۳۹]

ہزارہ چونکہ ایک اسلامی معاشرہ ہے اور وہاں بھی لوگ مذہبی رسومات پر عمل کرتے ہیں اور وضو کے فرائض اور نماز کے تمام ارکان کی ادائیگی مذہبی انداز سے کرتے ہیں۔ نماز بنیادی فرض ہے اس کی کوتاہی حالت جنگ میں بھی جائز نہیں اس لیے وہ سخت خطرے کے مقام پر بھی نماز ادا کرتے ہیں اور اختر رضا سلیمی نے اپنے کرداروں کے ذریعے اس رسم کا تذکرہ کیا ہے انھوں نے رسومات کا تذکرہ کرتے ہوئے کہانی کے پلاٹ کو جھول کا شکار نہیں ہونے دیا۔

مولوی صاحب امامت کرواتے ہیں اور نماز جیسے بنیادی رکن کی ادائیگی کی جاتی ہے۔ باجماعت نماز ادا کرنا مذہبی لحاظ سے بھی افضل ترین عمل ہے۔ نماز دین کے پانچ ارکان میں اہم ترین رکن ہے اور تمام ظاہری اور باطنی عبادتوں میں افضل ترین عبادت ہے۔ مذہب میں زیادہ عبادات کو نہ ہی بطور رسم ادا کرنا چاہئیے اور نہ ہی بہت اعمال کے لیے بلکہ اس کا اہم مقصد شعور کی بیداری ہونا چاہیے جو بیدار ہو جائے تو ساری زندگی ہی عبادت بن جاتی ہے اسی عبادت کی اہمیت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اختر رضا سلیمی میں نماز جیسی مذہبی رسم کا ذکر کیا ہے۔

مسلماں جب دشمنوں سے مقابلے کے لیے میدان میں اترتے تھے تو اپنے جذبات اور ارادوں کو مضبوط بنانے کے لیے اللہ کا نام لے کر آگے بڑھتے تھے۔ اس ناول کے کردار سید احمد بریلوی اور اسماعیل دہلوی جو مذہبی رجحان رکھتے تھے۔ اپنی فوج میں جذبہ و جنون بڑھانے کے لیے انھوں نے نعرہ تکبیر لگایا جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ خود اور ان کی فوج اللہ کے لیے ہے اور انھوں نے اپنے آپ کو اللہ کے سپرد کیا ہے اور پورے جوش ولولے کے ساتھ آگے بڑھے۔ "سید احمد بریلوی اور اسماعیل دہلوی بھی اپنی مختصر سی فوج لے کر میدان میں اتر گئے اور نعرہ تکبیر اللہ اکبر کے نعرے بلند کرتے ہوئے جوابی کاروائی میں مصروف ہو گئے۔"(۴۰) ہزارہ میں بھی لوگ جنگیں لڑتے ہوئے اپنی اسلامی ثقافت کو فراموش نہیں کرتے بلکہ اس پر عمل کرتے ہیں حالت جنگ سے لے کر اگر کوئی مزدور معمولی کام بھی کر رہا ہے تو وہ اسی طرح کے کلمات ادا کرتا ہے۔

پہاڑی علاقوں میں مزدور جب پتھر توڑتے تھے اور انھیں اپنی جگہ سے ہٹاتے تھے تو اس وقت بھی اللہ اکبر کا نعرہ بلند کرتے اور اس کام کو کر گزرتے۔ نعرہ تکبیر پڑھنے سے لوگ اپنے اندر ایک طاقت محسوس

کرتے تھے۔ پہاڑی علاقوں میں لوگ اپنی آسانی کے لیے سڑکیں مل کر خود ہی بناتے تھے۔ بڑے بڑے پتھروں کو توڑنے اور ہٹانے کے لیے یہی نعرہ لگاتے تھے جس کا ذکر ناول میں کئی جگہ موجود ہے۔ ''اللہ اکبر کا نعرہ لگاتے ہوئے کڑی کو یک بارگی اٹھا کر بچھالی دیوار پر اس طرح جما دیا۔''(۴۱) اس اقتباس میں ناول نگار نے ہزارہ کے لوگوں کی تعریف کی ہے وہ مضبوط جسم کے مالک ہوتے تھے۔ اور کوئی بھی کام کرنے وہ دریغ نہیں کرتے تھے۔ اور ان لوگوں میں اچھی بات یہ تھی کہ کوئی بھی کام شروع کرنے سے پہلے بسم اللہ اور پھر کوئی بھاری کام کرتے ہوئے اللہ اکبر کہنا اور کام کو مکمل کرنا بہت خوبصورت احساس تھا۔ ہزارہ میں لوگ کچے گھروں میں رہتے تھے۔ گھروں کی چھت بھی لکڑیوں سے بناتے اور پھر اس کے اوپر مٹی ڈال دیتے تھے۔ جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر لاتے اور چھت بناتے اس تمام عمل میں لوگ ایک دوسرے کی مدد کرتے اور بھاری سی بھاری کڑی اٹھا کے لاتے۔ چھت پر رکھتے ہوئے نعرہ تکبیر بلند آواز میں کہتے۔

مسلم معاشرے کی ایک باقاعدہ اسلامی رسم ہے جس کو اذان کہا جاتا ہے۔ فجر، ظہر، عصر، مغرب اور عشاء ان پانچ اوقات میں مسجد میں اذان بلند ہوتی ہے۔ لوگ مسجد میں اکٹھے ہوتے ہیں اور باجماعت نماز ادا کرتے ہیں۔ اختر رضا سلیمی نے اپنے ناول میں رسم اذان کا ذکر کیا ہے ''بستی کے مسجد کے میناروں سے مغرب کی اذان بلند ہوتے ہی وہ اپنی تیاریوں میں مصروف ہو گیا۔''(۴۲) ناول نگار نے اپنے ناول میں ہزارہ ثقافت کو بیان کیا ہے۔ جہاں لوگ ایک منظم زندگی گزارتے ہیں۔ صبح جلدی اٹھنا اور مسجد میں باجماعت نماز ادا کرنا لازم سمجھتے ہیں۔ بزرگوں کو دیکھ کر اس علاقے کے نوجوان بھی اذان کی آواز سنتے ہی کام چھوڑ کر نماز کی تیاری میں لگ جاتے تھے۔ اور یوں نماز پانچگانہ ادا کرتے ہیں۔

تمام مذاہب میں مرنے والے کے ساتھ الگ الگ سلوک رواں رکھا جاتا ہے۔ کوئی مرنے والے کو جلا دیتے ہیں کوئی مرنے والوں کو پھینک دیتے ہیں کہا جاتا ہے کہ موت برحق ہے اور موت سے کسی کو دستگاری ہے اور یہی سب سے بڑی حقیقت ہے کہ دنیا میں جو بھی آیا ہے اس کا جانا لازم ہے ہر چیز کو فنا حاصل ہے لیکن اس اٹل حقیقت کو جاننے کے باوجود سب ہی موت سے خوفزدہ رہتے ہیں۔ مرنے کے بعد کیا ہو گا یہ ایک ایسا

سوال ہے جس کا جواب ہر مذہب کا فرد اپنے عقیدے کے مطابق دینے کی کوشش کرتا ہے۔ مرنے والے عزیز واقارب کو یاد کرنا، ان کے لیے مخصوص دنوں تک صف ماتم بچھائے رکھنا، اور اظہار غم کرنا اور ان کے آخری رسومات کے حوالے سے ہر مذہب اور ثقافت میں الگ الگ اطوار اس علاقے کی تہذیب و ثقافت اور اس کے علاوہ حالات پر بھی منحصر ہوتی ہے۔ کچھ خطوں کی رسومات خاصی بھیانک ہوتی ہیں مثلاً کچھ ثقافتوں میں مردے کو کھا جانا اسے عزت و تکریم دینے کا بہترین طریقہ خیال کیا جاتا تھا۔ تاہم یہ رسم ابھی رواج کا حصہ نہیں رہی۔ بدھ مت مذہب میں مردے کو کھلے آسمان کے نیچے رکھ دیا جاتا اور گدھ اس کو گوشت چٹ کر جاتے یا اس کے علاوہ وہ جلانا پانی میں بہانا یا اسٹو یا بنانے جیسے طریقے بھی کرتے ہیں۔ یہودیت، عیسائیت اور دینِ اسلام سمیت بہت سے ایسے مذاہب ہیں جن میں مردے کی آخری آرام گاہ قبر ہی مانی جاتی ہے۔ مذہب اسلام میں مردے کو خصوصی احترام و اہمیت حاصل ہے۔ لیکن مسلمانوں کی رسومات میں یہ بات شامل ہے کہ وہ کسی بھی مردے کو باقاعدہ جنازہ پڑھ کر اس کے لیے آخری آرام گاہ قبر تیار کی جاتی ہے اور اسے دفن کیا جا ہے۔

اسلامی رسومات کے حوالے سے معاشرے کی ثقافتی عناصر کی نشاندہی کی جاتی ہے۔ اسلامی معاشرے میں جب کوئی مسلمان زندگی کی بازی ہار جاتا ہے تو اسے باقاعدہ نہلا دھلا کر سفید رنگ کا کفن پہنایا جاتا ہے اور یہ اسلامی معاشرے کی بنیادی رسم ہے۔ میت کو نہلانا دھلانا اور باقاعدہ ایک مخصوص طریقے سے غسل دینا اسلامی معاشرے کی مذہبی رسم ہے۔ فرہنگِ آصفیہ میں مولوی سید احمد دہلوی نے اس کی تعریف یوں کی ہے:

> "غسل میت: مردے / میت کو غسل دینا مردے کو نہلانا مرنے کے بعد میت / جنازہ کو غسل دیا جاتا ہے۔ ہر مذہب میں غسل کے اپنے طریقے ہیں۔ میت کو غسل دینے والے کو غسال اور عورت ہو تو غسالہ کہتے ہیں۔"(۴۳)

میت کو غسل دینے کے بعد ان کا باقاعدہ طور پر ایک لباس پہنایا جاتا ہے جسے کفن کہتے ہیں جو سفید رنگ کا ہوتا ہے اور ایک مخصوص انداز میں سلائی کیا۔ مردے کے کفن کے تین کپڑے (چھوٹی چادر،

بڑی چادر اور کفنی) اور اسی طرح عورت کے کفن کے پانچ کپڑے (چھوٹی چادر، بڑی چادر، کفنی، سینہ بند اور اوڑھنی) وغیرہ شامل ہے۔ اس کے علاوہ شہید کو زیادہ تر اپنے لباس میں بنا غسل اور کفن کے دفن کیا جاتا ہے۔ "کفنانا: مرنے بعد میت کو نہلا کر غسل دے کر کفن پہنایا جاتا ہے جو عموماً سفید رنگ کی چادریں ہوتی ہے۔"(۴۴) مسلمانوں کے معاشرے میں کسی فرد کے مرنے کے فوراً بعد ہی اس کو کفنانے اور دفنانے کا بندوبست شروع کر دیا جاتا ہے اور اسے باقاعدہ اسلامی مذہبی رسومات ادا کرنے کے بعد دفن کیا جاتا ہے۔ اختر رضا سلیمی نے معاشرے کی ثقافت کو یوں بیان کیا ہے:

> "اتنے میں صبح ہو جاتی ہے اور اس کے ارد گرد پھر سے ایک میلہ سج جاتا ہے۔ اسے نہلا دھلا کر کفن پہنایا جاتا ہے؛ اس پر طرح طرح کی خوشبوئیں چھڑکی جاتی ہیں اور اسے ایک چارپائی پر ڈال کر باہر صحن میں رکھ دیا جاتا ہے۔"(۴۵)

اختر رضا سلیمی نے اپنے ناول میں کفن کا ذکر متعدد جگہوں پر کیا ہے۔ یہ ایک اسلامی اور باقاعدہ رائج رسم ہے۔ اس رسم کو مسلمان فرض عین سمجھتے ہیں اور اس میں کوئی غلطی نہیں کرتے۔ مختلف علاقوں میں کفن کے سینے اور اس کی تیاری کے طریقے الگ الگ ہیں اکثر لوگ کفن کے اوپر کچھ قرآنی آیت، کلمہ یا آیت کریمہ یا مختلف طرح کے کلمات لکھتے ہیں۔ اور کچھ علاقوں میں ایسا نہیں کیا جاتا الغرض کفن پہنانا ایک ایسی رسم ہے جس میں ذرا برابر بھی غلطی کی گنجائش نہیں۔ تمام علاقوں کے لوگ خواہ کسی بھی عقیدے سے متاثر ہوں مذہب اسلام میں کفن دفن ایک لازم فریضہ ہے جسے تمام لوگ مانتے ہیں۔

مختلف معاشروں میں اور مختلف مذاہب میں مردے کے ساتھ ناورا سلوک رکھا جاتا ہے۔ ہندو مذہب میں مردے کو اس کا کریا کرم کر کے جلا دیا جاتا ہے۔ پارسی مذہب میں ان اپنا بنا گیا ایک کنواں ہوتا ہے جس میں ڈال دیا جاتا ہے لیکن اسلامی معاشرے میں ایسا نہیں ہوتا۔ مذہب اسلام میں جب کوئی خالق حقیقی سے جا ملے تو سب سے پہلے کفن دفن کے بعد اس متعدد خوشبویں چھڑکی جاتی ہیں اور اس کے بعد اس کے لیے باقاعدہ قبر کھودی جاتی ہے جس میں اسے دفن کیا جاتا ہے۔ قبر کھودنے کی رسم کا ذکر فرہنگ آصفیہ میں

بھی ملتا ہے "گور گڑھا کرنا، مردے کو گاڑنا، دبانا، کفن کاٹی کرنا۔ تجہیز کے معنی مردے کا سامان تیار کرنا اور تکفین کے معنی کفن پہنانا ہے۔"(۴۶) مسلم معاشرے میں جب کوئی مسلمان مر جاتا ہے تو اس مردے کو زمین میں دفن کیا جاتا ہے۔ اور اس کے لیے باقاعدہ گور تیار کی جاتی ہے اور قبر ایک مخصوص طریقے سے بنائی جاتی ہے۔ اختر رضا سلیمی نے اس ناول میں قبر کا ذکر یوں کیا ہے "قبر کھودی جا چکی تھی۔ نور خان نے قبر کے سرہانے والی سمت کھڑے ہو کر اس کے اندرونی حصہ کا جائزہ لیا۔"(۴۷) جس پس منظر میں یہ ناول لکھا گیا ہے۔ وہ ایک اسلامی معاشرہ ہے اور اس میں تمام رسومات پوری مذہبی طریقے سے ادا کی جاتی ہے۔ قبر کھود کر مردے کو قبر میں دفن کر دیا جاتا ہے۔ مردے کو لحد میں اتارنے سے پہلے مسلمانوں کی ایک رسم یہ ہے کہ اس کی نماز جنازہ پڑھی جاتی ہے۔ اور اس کے بعد اس کو عزیز و اقارب مل کر قبر میں اتارتے ہیں نمازِ جنازہ جیسی رسم کو سید احمد دہلوی بھی بیان کیا ہے "یہ رسم صرف مسلمانوں میں رائج ہے۔ وہ نماز کفایہ جو مردے کی نجات کے واسطے اُس کی لاش پر کھڑے ہی کھڑے پڑھتے ہیں۔"(۴۸)

اختر رضا سلیمی نے بھی اس رسم کو بیان کیا ہے اور نماز جنازہ کے ساتھ ساتھ اجتماعی نماز جنازہ کا بھی ذکر کیا ہے اور مختلف جگہوں پر بیان کیا ہے۔ مسلمانوں کے ہاں نماز جنازہ فرض کفایہ ہے جو ادا کرنا اس کے عزیز و اقارب پر واجب ہے۔ مسلمان مردے کی نماز جنازہ کے بغیر اس کو دفنایا نہیں جاتا ہے۔ اور اگر کوئی ایسا نہیں کرتا ہے تو یہ ایک ایسی مذہبی رسم ہے۔ جس کا کفارہ ممکن ہی نہیں ہے۔ اس ثقافتی عنصر کو اختر رضا سلیمی نے اپنے ناول میں یوں جگہ دی ہے "پندرہ منٹ پہلے جب ملبا ہٹانے کا کام روک کر اجتماعی نماز جنازہ کی تیاریاں شروع ہوئیں تو نوجوانوں کے گروپ نے بستی والوں سے درخواست کی کہ وہ فرض کفایہ ادا کریں۔"(۴۹) رسم جنارہ اسلامی رسم ہے۔ ہری پور ہزارہ کے لوگ بھی ہر حال میں ادا کرتے ہیں اور مرنے والے کی عزت و تکریم کرتے ہیں اور اس کے لیے خواہ وہ خاص ہو یا عام نماز جنازہ ضرور ادا کیا جاتا ہے اور یہ وہ فرض ہے جس کا کفارہ تک ممکن نہیں مرنے والے کے عزیز و اقارب اس رسم کو ضرور ادا کرتے ہیں۔ باقاعدہ نماز جنازہ کا اعلان کیا جاتا ہے اور لوگ جوق در جوق اس میں شامل ہو کر نماز جنازہ ادا کرتے ہیں۔

جب کوئی مسلمان مر جاتا ہے تو اس کے مرنے کے تیسرے روز ایک رسم ادا کی جاتی ہے جسے تیجا یا سوم / قل کہتے ہیں۔ سوم کے دن قرآن شریف کے ایک دو سپارے سب لوگ کر پڑھ کر قرآن شریف کا ختم پڑھتے ہیں اور مردے کی روح کو ایصالِ ثواب کیا جاتا ہے۔

> "تیسرا، سوم، تیجا: مردے کا تیجا، موت کے بعد کی رسم ہے جس میں میت کے دفن کرنے کے تین دن بعد سوگ کیا جاتا ہے۔ لوگ تعزیت کے لیے آتے ہیں تیسرے دن رسم قل خوانی کی جاتی ہے۔ جس میں قرآن شریف پڑھا جاتا ہے۔ مرنے والے کے لیے یہ ایصالِ ثواب کی دعا کی جاتی ہے۔ آخر میں قل خوانی یا سوم میں شریک افراد کو کھانا کھلایا جاتا ہے۔ یہ رسم مسلمان گھرانوں میں رائج ہے۔ ہندوؤں میں ہی رسم تیجا / پھول چننا کے نام سے کی جاتی ہے۔"(۵۰)

اسلامی معاشرے کی یہ رسم قل خوانی کی رسم بھی کہلاتی ہے اس میں تمام عزیز و اقارب کو بلایا جاتا ہے۔ اور کھانا تقسیم کیا جاتا ہے اور قرآن پاک پڑھ کر اس کا ثواب بھی روح کو بھیجا جاتا ہے۔ اختر رضا سلیمی نے بھی اس ثقافتی رسم کا اظہار اپنے ناول میں کیا ہے۔ انہوں نے ٹیلی فونک انٹرویو میں بتایا کہ "ہمارے معاشرے میں ساتویں کا درود ہوتا ہے۔ جیسے دوسرے علاقوں میں سوم کی رسم ہوتی ہے۔"(۵۱)

اختر رضا سلیمی نے جس لوکیل میں یہ ناول لکھا ہے وہاں سوم کی ساتوں کا دور ہوتا ہے اور تمام مساکین و غربا، عزیز و اقارب کو بلایا جاتا ہے اور باقاعدہ کھانے کے انتظام کے ساتھ ساتھ قرآن خوانی بھی کروائی جاتی ہے۔ اور تمام لوگ باقاعدہ قرآن خوانی کے بعد دعا کرتے ہیں جسے ساتویں کا درود کہا جاتا ہے۔ اس رسم کا تذکرہ "جاگے ہیں خواب میں" ناول میں یوں ملتا ہے:

> "ابا حضور کی ساتویں کے درود کے فوراً بعد ایبٹ صاحب سے ان کے دفتر میں جمعہ خانکی معیت میں ملا، اور انہیں یقین دلایا کہ میں ابا کے وعدے کو ایک فرض سمجھ کر پورا کروں گا۔"(۵۲)

مسلمانوں کے گھروں میں عموماً کسی بھی کام کے ہو جانے یا کرنے سے پہلے متعدد جملے کہے جاتے ہیں جن کا عمومی طور پر مطلب دعائیہ ہوتا ہے مثلاً اگر کوئی خوبصورت، دلکش چیز دیکھی جائے تو ماشاء اللہ اور سبحان اللہ جیسے الفاظ کا استعمال کیا جاتا ہے اور اگر کوئی ایسی چیز یا ایسا کام جو نہیں ہونا چاہئیے یا کسی انسان کی یا بذات خود انسان کے لیے اچھا نہ ہو تو لا حولا و قوۃ، یاحسبی اللہ جیسے الفاظ ادا کیے جاتے ہیں اسی طرح اگر کوئی مر جائے تو اس کے مرنے پر یہ انا للہ و انا الیہ راجعون پڑھا جاتا ہے۔ اختر رضا سلیمی نے اس رسم کا اظہار اپنے ناول میں یوں کیا ہے:

> "ہو سکتا ہے چھوٹے سردار جی زندہ ہوں" اس کے دل میں موہوم سی امید ابھری، کچھ دیر منہدم حصے کا جائزہ لینے اور شگافوں میں کان لگا کر کچھ سننے کی کوشش کے بعد اس نے دل ہی دل میں انا للہ و انا الیہ راجعون پڑھا۔ سر کے صافے سے اپنے آنسو پونچھے۔"(۵۳)

مذہب اسلام امن کا دین ہے۔ دنیائے عالم پر موجود تمام مذاہب سے تعلق رکھنے والے لوگ کسی نہ کسی صورت اپنی مذہبی رسومات اور عبادت کو ادا کرتے ہیں۔ بندگی اور عبادت کے بارے میں عام طور پر لوگ یہ قیاس کرتے ہیں کہ صرف ارکانِ دین کو پورا کرنے کا نام عبادت ہے لیکن در حقیقت میں ایسا ہر گز نہیں ہوتا۔ عبادت کا یہ مفہوم محدود اور ناقص ہے۔ اسی لیے لفظ عبادت کو وضاحت کے لیے اسلام کی تعلیمات کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں "ترجمہ: لوگو! اپنے رب کی عبادت کرو جس نے تمہیں اور تم سے پہلے لوگوں کو پیدا کیا شاید کہ تم پرہیز گار بن جاؤ۔"(۵۴)

مذہب اسلام میں عبادت کا تصور مختلف ہے ہر مذہب کا عبادت کے حوالے سے اپنا نقطہ نظر ہے اور ہر کسی کی مذہبی رسوماتِ عبادت دوسرے سے مختلف ہیں۔ اختر رضا سلیمی نے اپنے ناول میں اس کا ذکر یوں کیا ہے:

"ہم خود مذہبی لوگ ہیں اور مذہبی رواداری کے قائل ہیں۔ میں خود مذہب کا پابند ہوں۔ اتوار کو میں جہاں کہیں بھی ہوں۔ صبح کے وقت عبادت ضرور کرتا ہوں اس سے مجھے دلی طمانیت ہوتی ہے۔ میں ذاتی طور پر سمجھتا ہوں کہ کوئی بھی مذہب ہو اس کی تعلیمات نیکی کی طرف لاتی ہیں اور انسان کو بُرائی سے بچاتی ہیں۔"(۵۵)

یہ مذہب کا حصہ ہے کہ کوئی بھی فرد کسی بھی مذہب سے تعلق رکھتا ہو۔ دلی سکون عبادت مذہبی رسومات کی ادائیگی کے بعد ہی ملتا ہے۔ روحانی سکون کے حصول کی تمام لوگوں کو ضرورت ہوتی ہے اور یہ مذہبی روایات کی ادائیگی سے میسر آسکتا ہے۔ اختر رضا سلیمی نے بھی ناول میں اسی بات کا ذکر کیا ہے کہ مذہبی رسومات کی ادائیگی سکون قلبی کے لیے ضروری ہے اور ہزارہ کے لوگ بھی مذہبی رسومات کی پابندی اسی لیے کرتے ہیں۔

نماز کی ادائیگی کے بعد مسلمانوں کی عبادت کا مغز دعا ہے اور مسلمان دعا کا باقاعدگی سے اہتمام کرتے ہیں دعا میں اپنی خواہشات حسرتوں اور جذبات کو بیان کیا ہے یہ بھی مسلمانوں کی ایک مذہبی رسم ہے اور ثقافت کا بنیادی حصہ ہے۔ دعا کسی بھی خاص موقع پر بھی خصوصی طور پر مانگی جاتی ہے۔ دیہات میں جب بھی قحط پڑھ جائے، بارشوں کا سلسلہ ختم ہو جائے تو مسلمان اجتماعی دعا مانگتے ہیں اور جس بھی عمل کے لیے کیا جائے ان کا عقیدہ ہے کہ وہ کام پورا ہو جاتا ہے۔ اختر رضا سلیمی نے اس ناول میں اس مذہبی رسم دعا کو یوں بیان کیا ہے "نماز کے بعد خدا کے حضور گڑگڑا کر بارش رکنے کی دعا مانگی گئی۔"(۵۶)

رسم قل خوانی کے بعد مسلمانوں کے ہاں ایک اور اہم رسم رائج ہے جو مرنے والے کے سوا مہینے بعد ادا کی جاتی ہے۔ اسے رسم چہلم بھی کہتے ہیں۔ مذہبی رسومات میں مسلمان مردے کے لیے ادا کی جانے والی اس رسم کی اہمیت بھی کسی صورت کم نہیں ہے۔ باغ و بہار میں میر امن نے بھی چالیسویں کی رسم کو بیان کیا ہے۔ چالیسویں سے مراد چالیس کی گنتی کو پورا ہونا۔ مسلمانوں کے ہاں جب کوئی مرتا ہے تو چالیس دن کے بعد قرآن پڑھایا جاتا ہے اور تمام لوگ مل کر قرآن پاک کا ختم پڑھتے ہوئے اور مرنے والے کو ایصال ثواب

کرتے ہیں۔ سہیل بخاری نے اپنی کتاب میں اس رسم کا ذکر یوں کیا ہے "چہلم میں اپنے بیگانے چھوٹے بڑے جمع ہوئے جب فاتحہ سے فراغت ہوئی سب نے فقیر کو باپ کی پگڑی بندھوائی۔"(۵۷)

چہلم پر مخصوص لوگوں کو نہیں بلایا جاتا ہے گاؤں اور شہر کے رشتے داروں کے علاوہ دوست احباب اور جان پہچان والوں کو اس چہلم میں مدعو کیا جاتا ہے۔ قرآن خوانی اور خصوصی مغفرت کی دعا کی جاتی ہے اور قرآن پاک کے ختم ان کو ایصال ثواب کیے جاتے ہیں تاکہ قبر کی منزلیں آسان ہو سکیں۔ چالیسویں کی رسم کو چہلم بھی کہتے ہیں چہلم میں چالیس دن تک سوگ منایا جاتا ہے اور چہلم کے سوگوار سیاہ لباس دلہن کے غم کا اظہار کرتے ہیں۔ فرہنگ آصفیہ میں اس رسم کا ذکر کیا گیا ہے "چہلم وہ رسم ہے جو میت کے سوا مہینے بعد ادا کی جاتی ہے اس رسم کو چالیسواں بھی کہتے ہیں۔ چہلم اور چالیسواں ہندوستانی مسلمانوں کی رسم ہے۔"(۵۸)

اس رسم کا تذکرہ اختر رضا سلیمی نے دوسرے ناول جندر میں کیا ہے جو کہ در حقیقت میں ہری پور ہزارہ کی لوکیل میں ہی لکھا گیا۔

ii. توہمات

اسلامی تعلیمات جو مسلمانوں کے لیے ضابطہ حیات ہیں۔ اسلامی تعلیمات سے دور رہنے کی وجہ سے آج مسلم دنیا میں بہت سی نئی ان گنت باتیں رواج پا گئی ہیں۔ ایسی تمام باتوں کا ذکر اسلام میں نہیں ہے۔ معاشرے میں دیکھا جاتا ہے کہ شروع کے تیرہ تاریخوں کو منحوس سمجھا جاتا ہے اور دنوں میں شادی بیاہ اور دور دراز مقامات کا سفر بھی نہیں کیا جاتا ہے۔ اس حوالے سے دیکھا جاتا ہے کہ چنے ابال کر بعض مقامات پر تقسیم کیے جاتے ہیں۔ اسی طرح اب صفر کے مہینے کو تیرہ تیزی رکھ دیا گیا ہے افسوس سے کہنا پڑ جاتا ہے کہ اس ماہ کو بھی منحوس قرار دیا جاتا ہے۔ دینِ اسلام ایک دینِ فطرت اور دینِ انسانیت ہے۔ یہ ایک مکمل اور کامل سچا دین ہے۔ اسلام نے پوری کائنات کی رہنمائی کی ہے۔ توہم پرستی کا نظریہ در حقیقت اسلام کے منافی عمل ہے۔ اس کا تاریخی پس منظر یہ ہے کہ اسلام سے پہلے اس صفر کے مہینے کے حوالے سے کئی باتیں مشہور تھیں۔

جن میں ایک یہ کہ اس مہینے میں آسمان سے بلائیں اور آفتیں اترتی ہیں۔ اس لیے لوگ اس توہم کو حقیقت سمجھ کر اس مہینے میں کہیں جانے سے گریز کرتے تھے اور اسے جنگ وجدال کے حوالے سے بھی منحوس سمجھتے تھے اور جوں ماہِ صفر ختم ہوتا تو آپس میں جنگ شروع کر دیتے تھے۔

انسانی ذہنی ساخت کا اہم نکتہ ہمیں اساطیر اور توہم پرستی سے ملتا ہے کہ انسان نے کلی طور پر کچھ ذہنی ارتقائی منازل طے کیں ہیں۔ سماجیات اور علوم بشریات ایسے علم ہیں جو ذہنی ساخت کی پیچدگی، تعلقاتِ انسانی اور پیچیدگی، معاشرتی بنت کے حوالے سے نیا جہاں آباد کیا۔ ان دونوں علوم نے خصوصی طور پر توہمات کی طرف بھی توجہ دی۔ گاؤں میں کم علمی کے باعث توہمات پرستی کا رواج بہت عام ہوتا ہے اور لوگ توہمات پر بہت زیادہ یقین رکھتے ہیں۔ اختر رضا سلیمی نے ناول "جاگے ہیں خواب میں" جس علاقے کے طور طریقے بیان کیے ہیں وہاں بھی توہم پرستی عام ہیں اور لوگوں نے یوں ہی من گھڑت باتوں کو مشہور کیا ہے۔ جیسے ناول میں لکھا ہے:

> "بہن! میں نے پرسوں شام کو ہی سمجھ گئی تھی کہ لالہ جی نہیں بچیں گے۔ جیسے ہی مغرب کی اذان بلند ہوئی تھی۔ گیدڑیوں نے منحوس آواز میں چلانا شروع کر دیا تھا۔ میں نے اسی وقت فقیرے کے کاکا سے کہا کہ یہ گیدڑیاں ہیں لیکن انہوں نے الٹا غصہ کیا اور کہنے لگے کہ تو ان کی دائی لگی ہوئی ہے۔ گیدڑ بھی تو ہو سکتے ہیں۔"(۵۹)

دیہات میں زیادہ تر لوگ اس طرح کی توہمات پر یقین رکھتے ہیں مثلاً گیدڑیوں کے رونے کی آواز، الو کے بولنے کی آواز، اور کالی بلی کا راستہ کاٹنا وغیرہ اسی طرح کی توہم پرستی پر ہزارہ کے لوگ یقین رکھتے ہیں اور اس گاؤں کی ثقافت میں بھی اسی طرح کی متعدد خرافات ہیں جن پر لوگ یقین رکھتے ہیں۔ گیدڑ کا چلانا اچھا نہیں سمجھا جاتا ان کے خیال میں جب گیدڑ چلاتا ہے تو ضرور کوئی ناگہانی آفت آتی ہے یہاں گیدڑ کے چلانے کے بعد ایک قیاس یہ کیا گیا کہ لالا جان کی بازی ہار دے گی اور صبح ایسی ہی خبر سننے کو ملی۔ زیادہ تر دیہات میں مختلف جانوروں کی آوازوں کو منحوس سمجھا جاتا ہے۔ یہ ناول ہزارہ ثقافت کے پس منظر میں لکھا گیا ہے وہاں بلی

کا راستہ کاٹنے کے علاوہ بھی مختلف قسم کی توہمات مشہور ہیں۔ مثلاً وہاں بلیوں کی آوازوں کو بھی منحوس سمجھا جاتا ہے جب یہ روتی ہیں یا چلاتی ہیں تو ان کے خیال میں ضرور کوئی ایسی انہونی خبر سننے کو ضرور ملتی ہے۔ ''میں نے کل دو بلیوں کو بھی سر جوڑ کر روتے ہوئے دیکھا''خدا خیر کرے'' (۶۰)اس علاقے میں بلیوں کا رونا اچھا نہیں سمجھا جاتا اسی لیے دونوں خواتین آپس میں باتیں کر رہی تھی کہ کل بلیاں یوں ہی سر جوڑ کر رو رہی تھیں اب خدا تعالیٰ کرے کہ کوئی ایسی بُری خبر سننے کو نہ ملے۔ اسی طرح مختلف جانوروں کی آوازوں کو بھی منحوس سمجھا جاتا ہے حالانکہ تخلیقات کسی نہ کسی وجہ سے تخلیق کی گئی ہیں ان کی حرکات و سکنات اور آوازوں کو خواہ مخواہ منحوس سمجھ لینا کم علمی کی علامت ہے۔ گاؤں میں توہم پرستی عام ہونے کی وجہ سے ایسی کئی توہمات ہر علاقے میں سننے کو ملتی ہیں۔ ''جاگے ہیں خواب میں'' ناول میں دو خواتین آپس میں گفتگو کرتے ہوئے وہاں کی توہمات کو یوں بیان کرتی ہیں:

> ''ابھی صبح سویرے جب میں ادھر کر آرہی تھی۔ میرا کتا آسمان کی طرف منہ کر کے بھونک رہا تھا۔ خدا خیر کرے کوئی اور مصیبت نازل نہ ہو۔''(۶۱)

کتے کا آسمان کی طرف منہ کر کے بھونکنا توہم پرستی کی ہی ایک قسم ہے جس میں یہ خیال کیا جاتا ہے اگر کتا اس انداز میں بھونکے گا تو ضرور کوئی آفت نازل ہو گی۔ ان کے خیال میں کتے کا بھونکنا کسی بُری خبر کی پیشن گوئی ہے۔ دیہات میں اکثر و بیشتر کچھ ناسخ العقیدہ لوگ ابھی تعویذ گنڈے، جادو ٹونے، سفلی اور کالے جادو اور جن پریوں اور بھوت پریت کے سائے پر یقین رکھتے ہیں اور بعض ایسی جسمانی اور ذہنی بیماریوں کا علاج محض اس لیے نہیں کرواتے ہیں کہ یہ کسی تعویذ گنڈے کا اثر ہے یا کسی جن بھوت کا سایہ ہے اور ان بیماریوں کو سایہ سمجھ کر ان کے لیے مختلف قسم کے ٹونے ٹوٹکے کرتے ہیں اور اکثر عاملوں کے پاس لے کر جاتے ہیں اور علاج کرانے کی کوشش کرتے ہیں۔ دیہات میں بسنے والے لوگ اپنی کم علمی اور جہالت کی وجہ سے جھاڑ پھونک سے علاج کرانے کو ترجیح دیتے ہیں اور یوں مختلف علموں کے پھیلائے ہوئے بھوت پریت کے مفروضوں کی وجہ سے بہت سے ایسے بیچارے لوگ مر جاتے ہیں جو ایسے امراض میں مبتلا ہوتے ہیں جن کا

علاج ممکن ہے۔ اسی صورت حال کو اختر رضا سلیمی نے اپنے ناول میں یوں بیان کیا ہے "کسی کے بقول وہ بہت پڑھ لکھ گیا تھا جس کی وجہ سے وہ پاگل سا ہو گیا تھا اور کوئی کہہ رہا تھا اس پر کسی پری یا جن کا سایہ تھا۔"(۶۲) ہزارہ چونکہ دیہاتی معاشرہ ہے وہاں بھی کم علم لوگ ایسی جن پریوں وغیرہ پر یقین رکھتے ہیں اور ان کے خیال میں یہ کوئی مافوق الفطرت عناصر نہیں ہیں بلکہ یہ بھی ہماری طرح موجود ہیں اور لوگوں پر اثر انداز ہوتے ہیں اور انھیں جانی ومالی نقصان پہنچاتے ہیں۔

بد شگونی اور توہم پرستی جیسے نظریات کے حامل لوگ کچھ چیزوں، واقعات یا علامات کو اپنے لیے اچھا سمجھتے ہیں اور کچھ واقعات کو منحوس یا نقصان دہ۔ وہ ان واقعات کو خواہ مخواہ اپنے لیے بُرا سمجھنے لگتے ہیں۔ مختلف علاقوں اور ملکوں میں مختلف قسم کی توہمات ہوتی ہیں جیسے (ملک روس میں خالی بالٹی کہیں لے جانا)، اسپین میں اگر تیرہ تاریخ منگل کے دن کو آجائے تو اسے ملکی بد قسمتی کی علامت سمجھا نا، فن لینڈ کے لوگ یہ سمجھتے ہیں اگر مکڑی کو مار دیا جائے تو اگلے دن بارش ہو گی اسی طرح مسلمان معاشرے میں بھی توہم پرستی بہت زیادہ ہے اور زیادہ تر لوگ اس مرض کا شکار ہیں۔ جس علاقے کی ثقافت اختر رضا سلیمی نے "جاگے ہیں خواب میں" میں بیان کی ہے۔ وہاں بھی اسی طرح کی توہمات عام ہیں اور وہاں کے بزرگ بہت سی ایسی غیر منطقی باتیں آنے والی نسلوں کے ذہن میں انڈیلتے رہتے ہیں جس کا اظہار ناول میں یوں ہے "میں نے بڑوں سے سنا ہے کہ اکیلی قبر اچھی نہیں ہوتی ۔"(۶۳) وہاں کے دیہات میں یہ بات بہت عام ہے کہ دفن کرنے کے لیے مردے کی قبر قبرستان میں ہی بنائی جائے وہ آپ بوجہ مجبوری بھی کسی الگ تھلگ سی جگہ پر نہیں بنا سکتے کیونکہ اکیلی قبر کے بارے میں یہ گمان کیا جاتا ہے کہ وہ اچھی نہیں ہوتی ہے۔

اسی طرح کی ایک اور توہم جس کا ذکر ناول میں اختر رضا سلیمی نے یوں کیا ہے "میری ماں کہہ رہی ہے کہ اس پر سات گنجے لوگوں کے نام لکھ کر دو تا کہ انھیں بارش میں بہایا جائے۔"(۶۴) گاؤں میں بالخصوص پہاڑی علاقوں میں برفباری کے ساتھ ساتھ بارش بھی بہت زیادہ اور متواتر ہوتی ہے اور وہاں کے اہلِ علاقہ بارش کو روکنے کے لیے ٹوٹکے کرتے ہیں اور بارش کے حوالے سے بھی بد شگونیاں پال رکھی ہیں۔ مثلاً زیادہ بارش اچھی

نہیں سمجھی جاتی یا جمعرات کے دن سے شروع ہونے والی بارش اگلی جمعرات کو ہی رکے گی اور بارش کو روکنے کے لیے وہ مختلف حربے آزماتے ہیں جیسے یہاں اس کی ماں نے اسے نصیحت کی کہ ایک کاغذ پر سات گنجے افراد کے نام لکھو اور ان ناموں کو بارش کے پانی میں بہادو اور یوں بارش رک جائے گی۔ کوئی بھی انسان، جن، چرند پرند، پتھر، ستارے یا بے وقت کی بارش کسی انسان کی زندگی میں ہونے والے نفع اور نقصان کا خالق نہیں ہو سکتا لیکن دیہات میں یہ بات بہت عام ہے اور کم علم لوگ اس بات پر عقیدہ رکھتے ہیں۔

iii. اساطیر

کسی خطے کے رسوم ورواج کی جڑیں اس کے ماضی میں پیوست ہوتی ہیں حال کی ابتری اور مستقبل کے عدم یقین سے فرار ماضی کی خوشگواریت میں تلاش کرنا انسانی فطرت ہے۔ کسی فرد کا ماضی اس کی زندگی کی سادگی، اس کے آباواجداد اور واقعات کے فطری بہاؤ سے رومانوی طور پر بھی متاثر ہوتا ہے۔ کسی فرد کو اپنے اثرورسوخ میں طاقت ظاہر کرنے کے لیے اپنے آباؤاجداد کو دیرو طاقت ور کھانا زیادہ متاثر کن لگتا ہے۔ اور اسی طاقت کے ذرائع اسے مافوق الفطرت قصوں اور کرداروں میں پناہ لینے پر مجبور کرتے ہیں۔ معاشرتی حیوان اسطوری کرداروں سے زیادہ متاثر نظر آتا ہے۔ کوئی فرد عظمت وشان وشوکت کو بیان کرنے کے لیے آباؤاجداد، بادشاہوں اور گراں قدر ہستیوں میں پناہ لیتا ہے یعنی ان کے حالات وواقعات بیان کرتا ہے۔ زہر کے لیے اژدھا، نڈر اور دلیری کے لیے ببر شیر، مستعدی اور رفتار کے لیے گھوڑے، سرعت کے لیے پرندوں اور تگ ودو کے بغیر بہترین نتائج کے حصول کے لیے جن، دیو، ناگ، پری، بھوت پریت جیسے کرداروں کے دامن میں پناہ لیتا ہے۔ اسی پناہ گاہِ رومانوی کو اسطورہ کہتے ہیں۔ در حقیقت عربی زبان کا لفظ اسطورہ کا مادہ "سطر" ہے اور جمع اساطیر ہے۔

اساطیر لفظ کا استعمال عام ہے جبکہ اس کا اسم واحد ''اسطورہ'' شاذونادر ہی نظر آتا ہے اور زیادہ تر روایت کہانی یا متھ کا لفظ بھی استعمال کرتے ہیں۔ اگلے وقتوں کے لوگوں کے قصہ کہانی کو بھی اور قرآن حکیم میں کئی مرتبہ اساطیر الاولین" کا لفظ استعمال ہوا ہے جس سے مراد کہیں تو قصہ یا روایت اور مافوق الفطرت

واقعہ ہے۔ اسطورہ کے معنی قصہ، کہانی، حکایت کے ہیں خواہ وہ ادبی ہوں یا مذہبی۔ خرافات، مافوق الفطرت یا فوق البشر وجود کے ہیں۔ فوق البشر ہستی انسان جن، دیو، دیوتا اور پری ہو سکتے ہیں یہ عمومی طور پر ایک ایسی کہانی ہوتی ہے جس میں روحانی ہستیوں کے رہین سہن، رسوم ورواج یا پھر کائنات میں ان کے عمل دخل اور کائنات سے وابستہ ان کے تعلق کو بیان کرتی ہے۔ ادبی اصطلاحات میں ابوالاعجاز حفیظ صدیقی نے اسطورہ کی تعریف یوں کی ہے:

> "میتھ یا اسطورہ دیتوں رسمون، مذہبی شعائر واطوار، تکونین کائنات اور مختلف النوع مظاہر فطرت کو مفروضہ دیویوں، دیوتاؤں اور ماورائی طاقتون کی مفروضہ سرگرمیوں کے حوالے سے موضوع بناتا ہے۔ متھ کے لغوی معنی لفظ کے ہیں۔"(۶۵)

انگریزی میں اسطورہ کے لیے متھ کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے اسطورہ کی تعریف مختلف دائرہ ہائے معارف Encyclopedias نے اپنے اپنے انداز میں کی ہے۔ اساطیر کے مفاہیم تک رسائی اور اس کی اہمیت افادیت اسے آگاہی کے لیے مختلف دائرہ ہائے معارف اور مختلف لغات نے اس کی درج ذیل تعریف کی ہیں۔ "اساطیر (ع، مونث) جمع اسطارت کی، قصے کہانیاں"(۶۶) تخلیقی عمل از ڈاکٹر وزیر آغا نے اپنے مضمون میں اس کی تعریف یوں کی ہے:

> "اسطورہ یا متھ یونانی زبانی کے لفظ مائی تھوس سے ماخوذ ہے جس کا لغوی مفہوم ہے وہ بات جو زبان سے ادا کی گئی ہو یونی کوئی قصہ یا کہانی ابتداً اسطور کا یہی تصور رائج تھا لیکن بعدازاں کہانی کی تخصیص کر دی گئی، یوں کہ اسطور اس کہانی کا نام پایا دیوتاؤن کے کارناموں سے متعلق تھی یاان شخصیتوں کی مہمات کو بیان کرتی تھی جو زمین پر دیوتاؤں کی نمائندہ تھیں۔"(۶۷)

مختلف لغات نے اسطورہ کی تعریف مختلف انداز میں کی ہے۔ کائنات میں موجود روحانی ہستیوں کا معاشرے میں رہن سہن ثقافت اور معاشرے کو جنم دیتا ہے۔ اور جو تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں۔ اسطورہ اس کی وضاحت کرتی ہے اور اسی کو بیان کرتی ہے معاشرے میں موجود کردار خواہ وہ انسان ہو یا دیومیری ان کا رہن

سہن ثقافتی ہیت کے بغیر ممکن نہیں اس طرح کے حالات میں دوامکانات جنم لیتے ہیں۔ اسطورہ یا تو ثقافتی ہئیت اسطورہ کی تخلیق و نمو کرتی ہے۔ بنیادی طور پر اسطورہ کا اظہار ادب کے ذریعے ہی ہوتا ہے۔ اور پھر معاشرے میں فکری واحدنیت کی سطح ابھر کر آتی ہے۔ کسی بھی ناول نگار کے ہاں جب کوئی تخیل کار فرما ہوتا ہے تو اس کے خزانے میں داستان کا رنگ موجود ہوتا ہے اور اس کا سب سے بڑا ذخیرہ جن، دیو، پری، بھوت، موکل اور اساطیر کی صورت میں سامنے آتا ہے۔ اختر رضا سلیمی نے اپنے ناول میں اساطیری قصوں کو بیان کیا ہے اور ناول کو مزید دلچسپ بنانے کی شعوری کوشش کی ہے۔ انھوں نے وہ اساطیری واقعات بیان کیے ہیں جو ان کی ثقافت کا حصہ تھے اور وہاں عام تھے ناول میں انھوں نے ایک اساطیری واقعہ کو یوں بیان کیا ہے:

"ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ راجا رسالو کی بیوی رانی کو کلاں اور ایک آدم خور دیو کہیں چھپ کر ایک دوسرے پر فریفتہ ہو رہے تھے۔ راجہ کی بیوی کے ساتھ طوطے اور مینا کی ایک جوڑی بھی تھی۔ وہ دنوں اپنی رانی کی آدم خور دیو کے ساتھ قابلِ اعتراض حالت میں دیکھ کر بہت رنجیدہ ہوئے۔ مینا سے رہا نہ گیا، اس نے رانی کو برا بھلا کہنا شروع کر دیا۔ رانی نے غصے میں آکر مینا کی گردن مروڑ دی۔ مینا کا انجام دیکھ کر طوطا اڑ کر رجوعیہ کے میدان میں پہنچ گیا۔ جہاں راجا بے خبر سویا ہوا تھا۔ طوطے نے دریائے دوڑ میں اپنے پروں کو بھگو کر پانی راجا رسالو کے منہ پر چھڑکا پانی کے چھینٹے منہ پر پڑتے ہی وہ جاگ اٹھا۔ راجا کے جاگتے ہی طوطے نے اسے سارا ماجرا کہہ سنایا۔ (اوپر وادی میں موجود) پریوں والی غار میں آچھپا۔ راجا نے طوطے کی بتائی ہوئی جگہ پر پہنچ کر اپنی بیوی کو قتل کر دیا جب کہ دیو گھبرا کر بھاگ نکلا۔ راجا نے غار کا دہانہ ایک بڑی چٹان سے بند کر دیا لیکن جیسے ہی راجا اسے بند کر کے نیچے اترا، دیو نے زور لگا دیا۔ اور چٹان تیزی سے سرکتی ہوئی راجا کے پیچھے پیچھے میدان میں پہنچ گئی۔ وہ میدان کے آخری سرے سے نیچے گرنے ہی والی تھی کہ راجا نے اسے اپنے بائیں ہاتھ سے روک لیا۔ دیو نے یہ منظر دیکھا تو وہ مزید گھبرا گیا اور میلوں دور گند گر پہاڑ کی اک غار میں جا چھپا۔ جس کا دہانہ،

راجانے ایک اس سے بھی بڑی چٹان سے بند کر دیا اور چٹان کی اندرونی طرف ایک تیر کی مدد سے اپنی تصویر کندہ کر دی۔ جسے دیکھ کر دیو ڈر گیا اور اس نے وہاں سے نکلنے کا ارادہ ترک کر دیا۔ بستی والوں کے بقول وہ دیو آج بھی وہاں بند ہے۔ اور یہ کہ اس کے گرجنے اور کراہنے کی آواز گنڈ گر پہاڑ سے اب بھی کبھی کبھی آتی ہے۔ جو بادلوں کے دور سے گرجنے کی آواز سے مشابہ ہے۔"(۶۸)

جس طرح اختر رضا سلیمی نے تخلیقی کار فرمائی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ناول میں جس انداز سے طوطے کے کردار کو بنیاد بنا کر "راجا" اور "رانی"، "دیو" اور دیگر کرداروں کو جوڑا ہے یہ ایک واقعی مافوق لفطرت قصہ معلوم ہوتا ہے حقیقت میں ایسا ممکن نہیں کہ طوطا انسانی زبان میں باقاعدہ گفتگو کرے وہ کچھ الفاظ تو بول سکتا ہے لیکن اگر وہ ایک فوق البشر کی طرح کوئی قصہ بیان کرے گا تو اس تواتر اور تسلسل کے ساتھ بیان کرنے سے عاری ہے۔ لیکن یہ لکھاری کی خوبی ہوتی ہے کہ معاشرے میں موجود اس طرح کے واقعات کو بیان کرے کہ قاری کو آگاہی کے ساتھ ساتھ اس جبلی خواہش بھی پوری ہو سکے۔ اساطیر چونکہ ہماری ثقافت کا بنیادی عنصر ہیں جو اختر رضا سلیمی نے بڑی خوبصورتی سے بیان کیے ہیں۔ اسی طرح کی ایک اور دیومالائی قصہ جو اختر رضا سلیمی نے اپنے ناول "جاگے ہیں خواب میں" میں یوں بیان کیا ہے:

"الدبران پر نظر جماتے ہوئے اسے وہ ہندو دیومالا ضرور یاد آتی جس کے مطابق روہنی (الدبران) دلکش کی ان ستائیں بیٹیوں میں سب سے خوبصورت تھی۔ جنھیں اس نے چند دیوتا سے اس شرط پر بیاہا تھا کہ وہ ان میں سے کسی کی حق تلفی نہیں کرے گا۔ لیکن چندر دیوتا اپنی دوسری بیویوں کو نظر انداز کر کے ہر وقت روہنی پر فریفتہ ہوتا رہتا ہے روہنی کے باپ (دکش) کو جب علم ہوا تو وہ غصہ سے بپھر گیا اور اس نے چندر دیوتا کو سزا میں تخفیف کر دی گئی یوں وہ چندر دیوتا صرف پندرہ دن تپ دق میں مبتلا رہتا ہے۔ مہینے کے باقی دن اسے دوبارہ صحت یاب ہونے کی مہلت مل گئی۔"(۶۹)

سادہ اور عام حقیقت کو جب تخیلاتی اور جذباتی سطح پر بار بار پر کھا اور دوہرایا جاتا ہے تو داستانوی اوصاف اس کا حصہ بن جاتے ہیں۔ جب ایک واقعہ بار بار دہرایا جائے گا اس کا بیان علامتی صورت میں بدل جاتا ہے۔ صدیوں پر مشتمل انسانی شعور اور لاشعور کے ملاپ سے جو معجزہ سامنے آتا ہے وہ اساطیر کی صورت اختیار کر جاتا ہے۔ اسی تخیلی اسطورہ کو اختر رضا سلیمی نے اپنے ناول "جاگے ہیں خواب میں" میں اس طرح بیان کیا ہے "ان چٹانوں کے بارے میں مشہور ہے کہ چودھویں کے چاند کی راتوں میں پریاں ان پر بیٹھ کر چاند ڈھلنے تک چاندنی سے غسل کرتی رہتی ہیں۔"(۷۰) اساطیری واقعات بھی مختلف کرداروں سے بھرے ہوتے ہیں۔ خاص طور پر پریوں کی کہانیاں بہت سننے کو ملتی ہیں۔ ماحول اور مختلف مناظر بھی دیکھنے سننے میں آتے ہیں۔ پہاڑوں کا ذکر پریوں جنوں اور دیوتاؤں کے حوالے سے بہت ملتا ہے۔ مندرجہ بالا اقتباس میں بھی پریوں کا پہاڑوں پر بیٹھ کر چاند کی روشنی میں ایک دوسرے سے باتیں کرنا اور دیر تک چاندی میں رہنا، جب تک روشنی ماند نہیں پڑتی پریاں وہیں بیٹھی ہوئی چاندنی کے حسن میں نہاتی ہیں۔

اساطیری واقعات ہمارے معاشرے کا حصہ ہیں۔ ہمارے معاشرے میں ارد گرد متعدد ایسے واقعات ہوتے ہیں۔ جو عام لوگوں کی زبانی سننے کو ملتے ہیں۔ ان واقعات کی اگر حقیقی کوئی حیثیت ہو یا نہ ہو وہ تخیلاتی ہی کیوں نہ ہو۔ لیکن ان واقعات کو بیان کرنے والا راوی اس کو اس طرح بیان کرتا ہے کہ اس پر حقیقت کا گمان ہوتا ہے اور وہ قاری کو اس طرح حصار میں لیتا ہے کہ اس کو پتا ہی نہیں چلتا۔ اختر رضا سلیمی کی یہ خوبی ہے کہ انہوں نے ثقافتی مظاہر اور اساطیر کو اپنے ناول میں اس طرح بیان کیا ہے کہ پڑھنے والے کو حقیقت کا احساس ہوتا ہے۔ انھوں نے سید احمد بریلوی کے مسلک کو اپنے ناول میں اس طرح بیان کیا ہے کہ ان سے جڑے ہوئے تمام عقائد و نظریات بھی واضح ہو جاتے ہیں اور ان کی عام کردہ رسوم ورواج کا بھی پتا چلتا ہے۔ لیکن یہ ایک اساطیری واقعہ ہے۔ جس کے بارے میں یہ نہیں کہا جاسکتا ہے کہ حقیقت میں اس کی کوئی بنیاد ہے۔ ہمارے معاشرے میں ایسے بہت سے واقعات ہوتے ہیں جو خواہ مخواہ کسی بھی مسلک سے جوڑ لیے جاتے ہیں۔ اس بات سے بالاتر ہو کر یہ اس کا حقیقت سے کوئی تعلق ہے کہ نہیں اختر رضا سلیمی نے بھی اپنے ناول میں ایسے ہی ایک واقعہ کو جگہ دی ہے۔

تشکیل زبان اور مذہبی ارتقا سے متعلق آغاز وارتقا اور وضاحتیں اور ان کی اقدار کی قدر و قمیت کا تعین ہمیں رسومات اور اساطیر سے ہوتا ہے۔ کچھ ایسے واقعات ہوتے ہیں جو مافوق الفطرت عناصر کا مرکب ہوتے ہیں اور اپنی کرداروں سے مل کر بنتے ہیں اور ان واقعات کو سن کر اجنبیت کا یا ماورائی احساس ہوتا ہے۔ لیکن ہماری دیہاتی ثقافت کا یہ بنیادی حصہ ہے۔ دیہات میں اکثر گھر یا جگہ سے کوئی مافوق الفطرت دیومالائی واقعہ مشہور کر دیا جاتا ہے اور پھر وہ تمام لوگ اس پر مکمل یقین رکھتے ہیں۔ اسی طرح کئی ایک تخیلاتی اساطیری واقعات کو اختر رضا سلیمی نے اپنے ناول میں جگہ دی ہے۔

حوالہ جات

۱۔ اختر رضا سلیمی، جاگے ہیں خواب میں، دستاویز، لاہور، ۲۰۱۷ء، ص ۱۵۴

۲۔ ایضاً، ص ۱۷۷۔۱۷۶

۳۔ ایضاً، ص ۴۰

۴۔ صلاح الدین درویش، ڈاکٹر " جاگے ہیں خواب میں "، چند معنوی جہتیں، مشمولہ نقاط، فیصل آباد، شمارہ ۱۳، جون ۲۰۱۵ء، ص ۳۷۰

۵۔ اختر رضا سلیمی، " جاگے ہیں خواب میں "، ص ۱۱

۶۔ قاسم یعقوب، لاشعور کی نفسیاتی گرہیں اور کہانی کا خواب، مدیر محمد سلیم فواد کندی، اردو سخن پاکستان آبشار شمارہ ۴، ضلع لیہ، فروری ۲۰۱۷ء، ص ۲۶۶

۷۔ اختر رضا سلیمی، " جاگے ہیں خواب میں "، ص ۱۷

۸۔ ایضاً، ص ۱۸

۹۔ ایضاً، ص ۲۳

۱۰۔ ایضاً، ص ۵۷

۱۱۔ ایضاً، ص ۱۵۲

۱۲۔ ایضاً، ص ۱۹۱

۱۳۔ ایضاً، ص ۲۳۔۲۲

۱۴۔ ایضاً، ص ۱۳۔۱۲

۱۵۔ ایضاً، ص ۱۳

۱۶۔ ایضاً، ص ۱۳

۱۷۔ ایضاً، ص ۲۲

۱۸۔ ایضاً، ص ۵۱

۱۹۔ ایضاً، ص۱۳

۲۰۔ ایضاً، ص۵۱

۲۱۔ ایضاً، ص۲۴

۲۲۔ ایضاً، ص۱۲

۲۳۔ ایضاً، ص۹۶۔۹۵

۲۴۔ سید احمد دہلوی، مولوی، مولف، فرہنگ آصفیہ، جلد چہارم سنگ میل پبلی کیشنز، اردو بازار، لاہور، ۲۰۰۲ء، ص۲۷۲

۲۵۔ اختر رضا سلیمی، "جاگے ہیں خواب میں"، ص۹۴

۲۶۔ ایضاً، ص۵۹

۲۷۔ ایضاً، ص۱۷۸

۲۸۔ ایضاً، ص۵۱

۲۹۔ ایضاً، ص۱۱۸

۳۰۔ پاکستانی ادب، دستکاریوں کی ثقافتی اہمیت مضمون، سید امجد علی، ترتیب و انتخاب رشید امجد، فاروق، فروری ۱۹۸۲ء، ص۱۸

۳۱۔ اختر رضا سلیمی، "جاگے ہیں خواب میں"، ص۱۴۸

۳۲۔ ایضاً، ص۱۷۹

۳۳۔ ایضاً، ص۱۹

۳۴۔ ایضاً، ص۸۹

۳۵۔ ایضاً، ص۱۸۰

۳۶۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، قومی انگریزی اردو لغت، مقتدرہ قومی زبان، ۲۰۰۸ء، ص۱۳۶۷

۳۷۔ اختر رضا سلیمی، "جاگے ہیں خواب میں"، ۲۰۱۵ء، ص۹۱

۳۸۔ سورۃ الانفال، آیت نمبر ۳، سیپارہ نمبر ۹، رکوع نمبر ۱، منزل ۷

۳۹۔ اختر رضا سلیمی، ص۱۴۱

۴۰۔ ایضاً، ص۴۷

۴۱۔ ایضاً، ص۵۶

۴۲۔ ایضاً، ص۱۷

۴۳۔ سید احمد دہلوی، مولوی، مولف، فرہنگ آصفہ، جلد سوم، سنگ میل پبلی کیشنز، اردو بازار، لاہور، ۲۰۰۲ء، ص۳۰۶

۴۴۔ ایضاً، ص۵۳۳

۴۵۔ اختر رضا سلیمی، ص۲۳۷

۴۶۔ سید احمد دہلوی، مولوی، مولف، فرہنگ آصفہ، جلد سوم، سنگ میل پبلی کیشنز، اردو بازار، لاہور، ۲۰۰۲ء، ص۵۳۳

۴۷۔ اختر رضا سلیمی، ص۲۳۷

۴۸۔ سید احمد دہلوی، مولوی، مولف، فرہنگ آصفہ، جلد سوم، سنگ میل پبلی کیشنز، اردو بازار، لاہور، ۲۰۰۲ء، ص۶۰۲

۴۹۔ اختر رضا سلیمی، ص۱۵

۵۰۔ سید احمد دہلوی، مولوی، مولف، فرہنگ آصفہ، جلد سوم، سنگ میل پبلی کیشنز، اردو بازار، لاہور، ۲۰۰۲ء، ص۶۴۹

۵۱۔ اختر رضا سلیمی، انٹرویو، از رمشہ کنول، اسلام آباد، ۲۸جون۲۰۱۹ء، بوقت گیارہ بجے

۵۲۔ اختر رضا سلیمی، ص۸۵

۵۳۔ ایضاً، ص۱۰۸

۵۴۔ سورۃ البقرۃ، آیت نمبر ۲۱، سپارہ نمبر ۱، رکوع نمبر ۳، منزل نمبر ۱

۵۵۔ اختر رضا سلیمی، ص۷۵

۵۶۔ ایضاً، ص۶۴

۵۷۔ سہیل بخاری، ڈاکٹر، اردو داستان تحقیقی و تنقیدی مطالعہ، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، طبع اول، ۱۹۸۷ء، ص ۴۸۲

۵۸۔ سید احمد دہلوی، مولوی، مولف، فرہنگ آصفہ، جلد سوم، سنگ میل پبلی کیشنز، اردو بازار، لاہور، ۲۰۰۲ء، ص ۴۸۶

۵۹۔ اختر رضا سلیمی، ص ۶۰

۶۰۔ ایضاً، ص ۶۰

۶۱۔ ایضاً، ص ۶۰

۶۲۔ ایضاً، ص ۱۶۰

۶۳۔ ایضاً، ص ۶۰

۶۴۔ ایضاً، ص ۶۴

۶۵۔ ابو الاعجاز حفیظ صدیقی، ادبی اصطلاحات کا تعارف، لاہور، اشاعت اول، مئی ۲۰۱۵ء، ص ۲۴۰

۶۶۔ جامع اللغات، مؤلفہ خواجہ عبد المجید، اردو سائنس بورڈ، لاہور، جلد اول، ۱۹۸۹ء، ص ۱۶۲

۶۷۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، تخلیقی عمل، مکتبہ اردو زبان، سرگودھا، ۱۹۷۰ء، ص ۵۱

۶۸۔ اختر رضا سلیمی، ص ۱۴۔۱۵

۶۹۔ ایضاً، ص ۶۷

۷۰۔ ایضاً، ص ۱۳

باب سوم:

"جندر": ثقافتی عناصر کا مطالعہ

معروف شاعر اختر رضا سلیمی کا دوسرا اہم ناول "جندر" اکتوبر ۲۰۱۷ء میں رمیل ہاؤس آف پبلی کیشنز کی طرف شائع ہوا۔ اختر رضا سلیمی ناول "جاگے ہیں خواب میں" لکھ کر پہلے ہی اپنی شناخت قائم کر چکے تھے ان کے ناول کو افتخار عارف، انور شعور، محمد حمید شاہد، اسد محمد خان، مستنصر حسین تارڑ اور متعدد نامور ادیبوں نے اردو کا اہم سنگ میل کا درجہ دیا۔ ناول "جندر" کی کہانی ایک جندروئی کے گرد گردش کرتی دکھائی دیتی ہے جو جندر کی سریلی کوک کا قیدی ہوتا ہے ڈاکٹر ضیاء الحسن نے اپنے مضمون "جندر ایک وجودی ناول" تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے۔ میں "جندر" پڑھتے ہوئے جس قسم کے احساس سے دوچار ہوا ہوں، اس احساس سے اردو کا کوئی اور ناول پڑھتے دوچار نہیں ہوا[1] ان کا ناول جندر میں گاؤں کی زیادہ تر منظر کشی نظر آتی ہے اس ناول میں ماحول، منظر نگاری، تہذیب و ثقافت اور معاشرتی تعلقات جابجا نظر آتے ہیں جو اس علاقے کی خاص بات ہے۔ یہ ناول ایک معدوم ہوتی تہذیب کا معلوم ہوتا ہے۔

الف: "جندر" کے ماحول کا مطالعہ: ثقافتی تناظر میں

دنیا کی متعدد قدیم اور اعلیٰ تہذیبیں ہیں جن میں گندھارا کا نام بطور خاص لیا جاتا ہے۔ گندھارا تہذیب کے مآخذ و مظاہر پشاور اور چارسدہ دونوں میں پائے جاتے ہیں۔ تہذیب مرکز ٹیکسلا جس کا قدیم نام "ٹکسا شلا" تھا۔ اسی تہذیب و ثقافت کو اختر رضا سلیمی نے اپنے ناول میں بیان کیا ہے "ٹکسا" سنسکرت زبان میں کالے ناگ کو کہا جاتا ہے۔ قدیم وقتوں میں اکثر و بیشتر باشندے ناگ کی پوجا کرتے تھے جو آریائیوں کی آمد سے قبل یہاں آباد تھے جس کے بعد آریاؤں نے یہاں طاقت کے بازور پر یہاں حملہ کر کے قبضہ کر لیا اور وہاں اپنی حکومت قائم کی اپنے ثقافتی نظام کو رائج کیا۔ وادی ٹیکسلا کے قدیم آثار راولپنڈی سے کچھ میلوں کے فاصلے شمال مغرب کی طرف ایک سرسبز و شاداب وادی میں ہیں۔ ماہرین ادب کے نزدیک اپنے وقت میں آج سے تقریباً

اڑھائی سال قبل یہ شہر علم و ادب کا گہوارہ تھا اور تین بڑے راستے اس لہر میں داخل ہوتے تھے۔ ایک ایشیائی ممالک سے دوسرا مغرب یعنی یورپ اور تیسرا پشکلاوتی سے گزرتا ہوا دریائے سندھ کو عبور کر کے ٹیکسلا پر اختتام پاتا ہے۔ اس کے علاوہ ایک ہری پور ٹیکسلا اور دوسرا رستہ سری نگر۔ اسی طرح کے ہی ایک راستے کا ذکر اختر رضا سلیمی نے اپنے ناول جندر میں کیا ہے۔

> ''ان دنوں گاؤں اور اس کے پیچھے موجود وسیع و عریض سرکاری جنگل کو قصبے سے ملانے والی سڑک نہیں بنی تھی اور جنگل سے قصبے تک جانے کے لیے یہی واحد راستہ ہوا کرتا تھا۔ یہ راستہ جو اب اتنا تنگ ہو چکا ہے کہ یہاں سے گزرنے والا بہ مشکل اپنے کپڑوں کو جھاڑیوں میں الجھنے سے بچاتا ہے، تب خاصا چوڑا ہوا کرتا تھا۔ سرکاری نقشے میں، یہ اب بھی جنگل سے لے کر قصبے تک پورے گیارہ فٹ ہے، مگر عدم گزران کے سبب، اس کا حقیقی وجود سکڑ کر فٹ بھر ہی رہ گیا ہے۔ یوں تو یہ رستہ صدیوں سے موجود ہے اور ایک روایت کے مطابق یہ کسی دور میں کشمیر کو ٹیکسلا سے ملاتا تھا۔ اور نیپال اور ہندوستان کے دور دراز علاقوں سے تعلق رکھنے والے طالب علم، اسی رستے سے گزر کر ٹیکسلا یونیورسٹی میں پڑھنے جایا کرتے تھے لیکن اسے آج سے کوئی صدی بھر پہلے انگریزوں نے سرکاری جنگل میں آمد و رفت کے لیے ہموار کیا تھا اور اس کی چوڑائی گیارہ فٹ مقرر کی تھی۔ انگریز افسر اپنے گھوڑوں پر سوار ہو کر یہیں سے گزر کر جنگل کا معائنہ کرنے جاتے تھے۔''(۲)

اختر رضا سلیمی نے ناول ''جندر'' میں اس راستے کی خوبیوں اور خامیوں دونوں کو بیان کیا ہے کیونکہ وہ وادی ایک پہاڑی وادی ہے اس لیے اس راستے کی ناہمواری میدانی علاقوں کی ناہمواری سے مختلف ہے وہاں راستوں میں آنے والی مشکلات بھی الگ ہیں یہی وہ چیزیں جن کو اختر رضا سلیمی نے اپنے ناولوں میں ثقافتی تناظر میں بیان کیا ہے۔

ٹیکسلا دارالسطنت کی حیثیت رکھتا ہے یہاں تین بنیادی تہذیبوں کا امتزاج نظر آتا ہے اور اسی تہذیب کی وجہ سے وہاں کے ثقافتی پہلوؤں میں جگہ جگہ یہی تین تہذیبیں نظر آتی ہیں جن میں ہندوستانی، ایرانی اور یونانی تہذیبوں نے اس علاقے کو ایک کثیر الثقافتی علاقہ بنا دیا اور ٹیکسلا کی شہرت دور دور تک پھیل گئی۔ جس طرح دلی کا ذکر بطور خاص اور علم و ادب کی بنیادی حیثیت کا حامل تھا یونہی ٹیکسلا بھی دور دراز سے لوگ علم کے حصول کے لیے آتے رہے۔ ڈاکٹر رشید امجد کی مرتبہ کتاب میں قدرت اللہ فاطمی نے اپنے مضمون میں لکھا ہے کہ:

> ''چھٹی صدی قبل مسیح میں ٹیکسلا (ٹیکشلا، ٹکشیشلا) یونیورسٹی کے قیام کے بعد ٹیکسلا اپنی تاریخ کے بلند ترین مقام تک پہنچ گیا۔ یہ یونیورسٹی تاریخ انسانی کی قدیم ترین اور منفرد درس گاہوں میں سے ایک ہے۔ اس یونیورسٹی نے مہاتما بدھ کے پیغام کو وسطی ایشیا اور مشرق بعید تک پہنچایا۔''(۳)

جندر میں اختر رضا سلیمی نے پہاڑی علاقے کی ثقافت کو بیان کیا ہے۔ پہاڑی علاقے میں موجود پتھریلے راستے پہاڑوں کی جھاڑیوں کو ذکر کیا ہے وہاں کے پتھریلے تنگ و تاریک راستوں کے علاوہ وہاں کی بود و باش بھی دوسرے علاقوں سے ثقافتی اعتبار سے مختلف ہے۔ وہاں کے لوگوں کی شادی کی رسوم و رواج میں ڈولی کی رسم ہوتی ہے اور جس گھر میں عورت کی ڈولی اترتی ہے اسے نصیحت کی جاتی ہے۔

جندر میں مصنف نے اس علاقے کے ماحول وہاں کے لوگوں رہن سہن کو بیان کیا ہے۔ وہاں کے علاقہ مکینوں کے صحن کچے ہوتے ہیں کیونکہ وہاں دیہاتی ثقافت ہے وہاں کے لوگ لکڑیاں بطور ایندھن استعمال کرتے ہیں وہاں پر سوئی (نادرن گیس) کا کوئی تصور نہیں ہے زیادہ تر عورتیں لکڑیاں خود ہی لاتی ہیں اور صحن چونکہ کچے ہوتے ہیں اس لیے انہیں لکڑیاں جلانے کے لیے کسی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑتا ہے۔ وہاں لوگ صحن میں کچے چولہے بناتے ہیں اور آگ جلا کر کھانا بناتے ہیں یہی وہاں کے لوگوں کے ماحول کا حصہ ہے۔ علاقے میں چونکہ سبزہ بہت زیادہ ہوتا ہے۔ لوگ زیادہ تر جانور پالتے ہیں اور جانوروں میں وہ سست

جانوروں کو نہیں پالتے مثلاً بھینس ہمیں صرف پنجاب کی ثقافت میں ہی نظر آتی ہے وہاں لوگ زیادہ تر بکریاں، گائے، مرغیاں اور اس طرح کے پرندے اور جانور پالتے ہیں۔ جس کا تذکرہ کرتے ہوئے ناول کا مرکزی کردار جندر وئی اپنے الفاظ سے یوں کرتا ہے:

> ''میری زندگی کی پہلی یاد اس بکری کے دو سینگوں سے جڑی ہوئی تھی جیسا کہ میرے باپ نے مجھے بتایا تھا۔ میری ماں نے اپنی موت سے کوئی چار پانچ ماہ پہلے خریدا تھا اور دادی کی وفات کے بعد جب میرے باپ نے مجھے جندر پر ساتھ لے آنے کا منصوبہ بنایا تو اسے بھی ساتھ لے آیا کہ اب گھر میں اس کی دیکھ بھال کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ جندر پر آنے کے کچھ عرصے بعد بکری نے دو بکروٹے دیے جنھوں نے میری تنہائی کو ایک حد تک کم کر دیا۔''(۴)

گاؤں میں چونکہ نوکریوں کے موقع کم ہوتے ہیں لوگ زیادہ تر نوکریوں کی تلاش اور ضروریات زندگی اور معاشی ضرورتوں کے پیش نظر وہ شہروں کا رخ کرتے ہیں اور وہاں ہی کاروبار کرتے ہیں گاؤں میں رہنے والے لوگ بھی زیادہ تر شہر کو ترجیح دیتے ہیں اور اس بات کو معیوب نہیں سمجھتے وہاں پر زیادہ تر مرد شہر آ کر پیسے کماتے ہیں اور ان کا خاندان اور بیوی بچے گاؤں میں رہتے ہیں۔ ہری پور ہزارہ کے لوگ بھی معاشی ضروریات کے پیش نظر نقل مکانی کرتے ہیں۔

اکثر گاؤں اور اس کے مضافات میں میلوں اور عرسوں کا اہتمام کیا جاتا ہے اور زیادہ تر میلوں ٹھیلوں میں لوگوں کی سیر و تفریح کا بھی انتظام کیا جاتا ہے اسی طرح جندر ناول میں بھی اختر رضا سلیمی نے بیان کیا ہے کہ وہاں کے لوگ میلوں میں مختلف جانوروں اور پرندوں کی آپس میں لڑائی کرواتے ہیں اور اس سے لطف اندوز ہوتے ہیں اور وہاں کے لوگ باقاعدہ مرغوں وغیرہ کتوں اور اس طرح کے پالتوں جانوروں کو مخصوص غذائیں کھلا کر انہیں لڑائی کے لیے تیار کرتے ہیں اور گھر میں ان کو پالتے ہیں اور بڑے راجا بادشاہ سزا کے طور پر جلاوطن یا عمر قید کرنے کے بجائے انہیں بھوکے کتوں کے آگے ڈال دیتے ہیں راجاؤں اور بادشاہ کے حکم

عدولی ناممکن تھی اس لیے جو راجا سزا مخصوص کر دیتا تھا وہ ضرور ملتی تھی یہی اس پرانے دور کا ماحول تھا۔ اختر رضا سلیمی نے بھی انہیں حالات کی وضاحت اس طرح کی ہے۔

> ''وہ اچانک اپنی کرسی سے اُٹھا، ان دونوں سمیت، وہاں بیٹھے تمام لوگوں کو ساتھ لیا اور جندر کی طرف چل پڑا۔ وہاں پہنچ کر اس نے ایک نظر، جندر کے صحن میں پڑے ہوئے بھاری پاٹ پر ڈالی اور اعلان کیا کہ ان دونوں کو یہ پاٹ اُٹھا کر پورے ایک میل تک چلنا ہو گا اور اگر وہ ایسا کرنے میں ناکام رہے تو انھیں، میرے چار خوں خوار کتوں کا مقابلہ ایک بند کمرے میں کرنا پڑے گا۔'' (۵)

وہاں گاؤں میں اکثر اوقات سزا کے طور پر جرمانہ عائد کیا جاتا یا اسے جسمانی سزا دی جاتی۔ اس سزا میں کسی قسم کی کمی یا زیادتی نہیں کی جاتی اس پر عمل کرنا لازم ہوتا یہاں بھی مصنف نے ایسی ہی سزا کا ذکر کیا ہے۔ گاؤں میں بچیوں کو سکول پڑھانے کا رواج بہت کم ہوتا ہے زیادہ تر بچیوں کو گھریلو دستکاری گھر کے کام کاج اور اس طرح کے کام سکھائے جاتے ہیں وہاں بچیوں کا گھروں سے نکلنا معیوب سمجھا جاتا ہے لیکن جس ہزارہ کی ثقافت کو اختر رضا سلیمی صاحب نے بیان کیا ہے وہاں اس ثقافت میں کچھ پرانی چیزیں منہمک ہو رہی تھیں اور نئے کلچر کو اپنایا جا رہا تھا بیٹیوں کی تعلیم کو بھی اہمیت دی جانے لگی تھی۔ وہاں پر موجود پرانے خیالات کے مالک لوگ بھی اس کی حمایت کر رہے تھے اور جندروئی کی بیوہ (حاجرہ) وہ پہلی خاتون تھی جس نے میٹرک کا امتحان دیا جس کے بعد یہ ریت بھی چل پڑی تھی کہ اب بچیوں کو سکول پڑھایا جائے جندر سے لیا گیا اقتباس اس ثقافتی پہلو کو بیان کر رہا ہے۔

> ''وہ ہمارے گاؤں کی پہلی میٹرک پاس لڑکی تھی۔ ان دنوں ہمارے ہاں لڑکیوں کو پڑھانے کا رواج ہی نہیں تھا، جو لوگ تھوڑے باشعور تھے وہ بھی یہ مشکل پرائمری تک ہی بچیوں کو تعلیم دلواتے تھے کہ لڑکیوں کا ہائی سکول ان دنوں صرف بڑے قصبے میں

تھا جو یہاں سے سات میل دور تھا۔ قریبی گاؤں میں صرف لڑکوں کا ہائی سکول تھا اور لوگ مخلوط تعلیم کے حق میں نہیں تھے۔"(۶)

گاؤں کے ماحول میں یہ بات بطور خاص ہوتی ہے کہ سب لوگ ایک دوسرے کو جانتے ہیں اور ایک دوسرے کو رسم تعظیمی ہی پوچھ لیتے ہیں گاؤں میں تقریباً سب ہی ایک دوسرے سے میل میلاپ رکھتے ہیں اور مل جل کر بیٹھتے اور باتیں کرتے ہیں۔ یہی خالص دیہات کی اہم بات ہوتی ہے سب ایک دوسرے کے گھروں میں بغیر کسی جھجھک اور ہچکچاہٹ کے چلے جاتے ہیں ایک دوسرے سے شاید انسانیت کا رشتہ بھی اسی لیے قائم ہو جاتا ہے اور شہر کے لوگ کی نسبت گاؤں والوں کی آپس میں ہمدردی اور بھائی چارے کے جذبات زیادہ ہوتے ہیں۔ اسی وجہ سے وہ ایک دوسرے کے خوشی و غم دونوں کے ساتھی ہوتے ہیں۔ اسی لیے اس کردار کے مرکزی ہیرو نے بھی شاید یہی بات اپنے والد سے بہت اچھی طرح سیکھ لی تھی جندر میں مصنف لکھتے ہیں۔ "چوں کہ وہ ہر تیرے چوتھے دن چچا کے ساتھ جندر پر آ جایا کرتا تھا اور میرے ساتھ کھیلتا رہتا تھا اور ہمارے درمیان ایک انسانیت کا رشتہ بھی تھا اس لیے اس کی موت نے میرے دماغ پر گہرا اثر ڈالا۔ میں کئی دن اس کے بارے میں متواتر سوچتا رہا۔"(۷) ان کے کرداروں میں اہم کردار جندر روئی کا ہے جو اپنے بیٹے کا تذکرہ کرتا ہے کہ اس کا بیٹا اس سے لگاؤ، محبت اور انسیت تو بہت کرتا ہے لیکن وہ شہر اپنی نوکری اور اپنے ذاتی کام کاج میں مصروف ہونے کی وجہ سے اپنے باپ کا خاص خیال نہیں رکھتا ہے۔ چونکہ گاؤں کے ماحول میں لوگ زیادہ تر نوکریاں شہر جا کر کرتے ہیں اور شہر گاؤں سے کئی میلوں کے فاصلے پر واقع ہے۔ باپ اور بیٹے کی محبت میں کسی قسم کا گمان نہیں کیا جا سکتا ہے۔ لیکن وہ اس معاملے میں یقیناً محبت پر بے یقینی کا شکار ہے کہ اگر میں مر بھی گیا تو میرے پاس آنے والا پہلا شخص میرا بیٹا راحیل نہیں ہو سکتا ہے۔

"میں نے اپنی موت کے بارے میں اتنا نہیں سوچا جتنا کہ اس آدمی کے میں، جو میرے بعد یہاں ۔۔۔۔ اس ویران جندر پر ۔۔۔۔ آنے والا پہلا شخص ہو گا۔ وہ کون ہو گا؟ اتنے دنوں کی سوچ و بچار کے بعد بھی میں، اس بارے میں، کچھ وثوق سے نہیں کہہ

سکتا۔ ہاں یہ بات میں پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ میرا بیٹا راحیل نہیں ہو گا۔"(۸)

وہ گاؤں آنے سے پہلے اپنے باپ کو اطلاع کرنے کے بجائے اس شخص کو اطلاع کرتا ہے جو ان کے علاقے کی مسجد کا خادم ہے یہ بھی در حقیقت ثقافتی کردار ہے۔ گاؤں میں مسجد کا ایک خادم لازمی مخصوص کیا جاتا ہے۔ معاشرے میں اس کا بہت عزت اور احترام کیا جاتا ہے اور تمام لوگ مل کر اس کی معاشی مدد کرتے ہیں یوں وہ گاؤں کے تمام لوگوں کے حالات وواقعات کے ساتھ ساتھ ان کے گھریلو و معاشی معاملات سے بھی اچھی طرح واقف ہوتا ہے۔ اپنے آنے کی اطلاع مسجد کے خادم کو پہلے دیتا ہے۔ راحیل کی بیوی جو کہ ایک شہری عورت ہے اور اس کے بچے شہر میں ہی پلے ہیں اس لیے اس گاؤں کی تمام رسوم وروایات سے ناواقف ہیں اس کی بیوی گاؤں کی ثقافت سے بیزار نظر آتی ہے گاؤں کے ماحول کو پسند نہیں کرتی ہے لیکن وہاں کے معتدل موسم (ٹھنڈک) کے مداح اس کے بچے اور بیوی دونوں ہی نظر آتے ہیں۔ وہ ثقافتی حوالے سے تنگ نظر ہے اسے لوگوں کے قریب جاتے ہوئے لوگوں کی پسینوں کی بدبو محسوس ہوتی ہے اور اس کے بچے جو اس موسم میں پڑنے والی سردی کو برداشت کو بھی برداشت نہیں کرتے انہیں اپنے آبائی گاؤں اور ان میں بسنے والے رشتہ داروں سے کوئی انسیت محسوس نہیں ہوتی ہے۔ اکثر اوقات اگر سخت جاڑے کا موسم ہوتا تو وہ (جب وہ دسمبر کی چھٹیاں یہاں گزارنے آتے) واپس چلے جاتے ہیں۔ اس کی بیوی روایتی بیوی کی طرح خرچوں پر (اخراجات) استفسار کرنے والی اور گاؤں یعنی اپنے سسرال آنے کے خیال سے بھی نکاہت کا احساس کرنے والی ہے جس کے ناول میں اس کے کسی فعل سے بھی یہ محسوس نہیں ہوتا ہے کہ اس دیہات سے کسی قسم کا دلی لگاؤ ہے۔ ناول میں اختر رضا سلیمی اس کردار کے رویے کو یوں بیان کرتے ہیں۔

"پھر وہ فوراً اپنی بیوی کو فون کرے گا جس پر یہ خبر بجلی بن کر گرے گی اور یہ سوچ کر اس کا بلڈ پریشر یک دم ہائی ہو جائے گا کہ ابھی دو ماہ پہلے گاؤں سے ہو کر آئے ہیں اب پھر جانا پڑے گا اور پھر اس پر اُٹھنے والے اخراجات اس پر مستزاد۔"(۹)

اس ناول میں ایک ہی اہم کردار بابا جمال دین کا کردار ہے جو ماحول اور معاشرے سے حد درجہ مطابقت رکھتا ہے وہ ایک روایتی کردار ہے جو جندروئی کے ساتھ مسلسل جڑا ہوا ہے وہ اس کے باپ کا بہترین دوست اور برادری کا ہونے کی وجہ سے اس کا جندروئی کے ساتھ مضبوط تعلق نظر آتا ہے۔ جمال دین نے بھی کافی عرصہ جندر پر گزارا اور ہمیشہ اس کے ساتھ وقت گزارتا ہے وہ ایک حقیقی آدمی ہے اور اسے نصیحتیں کرتا نظر آتا ہے۔ گاؤں کی مشہور اساطیری واقعات کو جس ثقافتی جزئیات نگاری کے ساتھ جمال دین کے کردار نے بیان کیا ہے اس سے کہ ہزارہ کی ثقافت کو جاننا نسبتاً زیادہ آسان لگتا ہے انہوں نے اس دور کے واقعات کو اس طرح بیان کیا ہے کہ قاری کے لیے یہ اندازہ لگانا مشکل ہے کہ یہ واقعات اساطیری ہیں یا حقیقت میں اس کی آنکھوں کے سامنے وہ واقعات رونما ہو رہے ہیں۔ جمال دین نے وہاں کے علاقوں کے مشہور واقعات کو ثقافتی انداز میں بتایا ہے جس سے اس علاقے کی تہذیب و ثقافت اور ماحول پر اس کے اثرات بھی واضح ہو گئے ہیں۔ مثلاً جس انداز میں انہوں نے جندر کا تذکرہ کیا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ جندر نے کس طرح تمام لوگوں کو آپس میں جوڑا ہوا تھا تمام نکات بیان کیے ہیں۔

اس ناول میں دو اہم کردار محمد خان اور احمد خان ہے جو غیر مرئی قوت کے حامل ہیں۔ انہوں نے اس دور میں ہونے والے بڑے بڑے محاذوں پر لڑائی کی اور فتح بھی حاصل ہے۔ سید احمد بریلوی کے ساتھ مل کر سکھوں کے خلاف جنگ میں کھڑے ہونے کے ساتھ ساتھ انہوں نے راجا کے بنوائے ہوئے جندر کے پاٹوں کو بغیر کسی آسرے کے اکیلے ہی جاتے مقام سے غائب کر کے کئی کلو میٹر دور لے جانے کا کام کیا۔ وہ ایسے پاٹ تھے جن کو چار، پانچ لوگوں نے بھی بمشکل اپنی جگہ سے ہٹایا تھا۔ ان پاٹوں کے وزن کا تذکرہ کرتے ہوئے اختر رضا سلیمی لکھتے ہیں۔

> ”وہاں موجود تمام لوگ انہیں پاگل سمجھ رہے تھے وہ تصور بھی نہیں کر سکتے تھے کہ جندر کا پاٹ جسے چار یا پانچ آدمی بہ مشکل اُٹھا کر فرلانگ تک لے جا سکتے ہیں، یہ دو پاگل اُٹھا کر پورے میل کا فاصلہ طے کر پائیں گے۔“(۱۰)

دونوں نے مل کے جندر کے پاٹ کو اس طرح اُٹھایا جیسے انہوں نے بھوسے کی گٹھڑی اُٹھائی ہو تمام لوگوں کو یقین ہو گیا کہ ان کے پاس غیر مری طاقت ہے جس کی بدولت انہوں نے وہ وزنی پاٹ اُٹھا لیے اور جندر کی بنیادی رکھی جو اس معاشرے کی ثقافتی شہ رگ ہونے کے ساتھ ساتھ اس ماحول کی بنیادی ضرورت تھی۔ ان دونوں نے وزنی پاٹ اُٹھانے سے پہلے جو تیاریاں کی وہ سراسر گاؤں کے ماحول کی عکاسی کرتی ہے۔ طاقت کے حصول کے لیے انہوں نے خالص دیسی چیزوں کا انتخاب کیا۔ انہوں نے دیسی گھی اور دیسی مرغے کھائے اور یوں شدید سردی کے موسم میں بھی ان کے جسم پسینے سے شرابور تھے۔

ثقافت معاشرے کے افراد کو جوڑتی ہے۔ ہر معاشرے کی تہذیب و ثقافت مختلف ہوتی ہے۔ اس ناول کے ماحول کا مطالعہ کیا جائے تو ہمیں خاص دیہات کا منظر نظر آتا ہے وہ دیہات جو کہ پہاڑی علاقے سے تعلق رکھتا ہے اس کے مسائل بھی اسی کی طرح ہیں یہاں بسنے والے لوگ اور اس ناول کے متعدد کرداروں کو اگر ماحول کے مطابقت سے پرکھا جائے تو ہمیں ایسا ماحول نظر آتا ہے جہاں میدانی علاقوں کے دیہات کی طرح کے مسائل تو نہیں ہیں بلکہ دوسری چیزیں نظر آتی ہے۔ اس ناول میں موجود کردار ماحول سے مطابقت رکھتے ہیں مصنف نے یوں پہاڑوں اور چٹانوں کی نظر نگاری اس طرح کی ہے کہ جندر پڑتے ہوئے آپ کو قطع یہ خیال نہیں آتا ہے کہ آپ کسی اور جانب متوجہ ہوں۔ مصنف نے جس علاقے کی ثقافت کو بیان کیا ہے اور یوں مسائل بھی اسی علاقے کے اجاگر کیے ہیں۔ حاجرہ بھی اسی معاشرے سے جڑا ہوا ایک کردار ہے۔ جو گاؤں کی لڑکی ہونے کے باوجود اپنے فیصلوں اور قول و فعل میں نڈر اور بہار تھی۔ وہ گاؤں کی واحد پڑھی لکھی لڑکی تھی اور مختلف کتابیں ناول افسانے پڑھ کر ان کے متعلق آزادنہ اپنے خیالات کا اظہار کرنے اور ان کو سمجھنے کے لیے اکیلی جندر کر میرے پاس آجایا کرتی تھی اور مجھ سے شادی کرنے کا فیصلہ بھی اس کا ذاتی تھی۔ حالانکہ جس ماحول میں ہم رہ رہے تھے وہاں لڑکی کا گھر سے باہر قدم رکھنا محال تھا۔ اور اس ماحول میں کسی بھی قسم کی خودسری ناممکن حد تک مشکل ہے۔

> ”گھر میں چھ بڑے بھائی اور سکول میں درجنوں لڑکے شاہد یہی وجہ تھی کہ اس کی طبیعت میں ایک طرح کا مردانہ پن سا آگیا تھا اور وہ تھی بھی لڑکوں کی طرح نڈر اور بے باک۔ ایک دفعہ کسی ہم جماعت لڑکے نے ہنستے ہنستے اسے آنکھ ماری تو اس نے آؤ

دیکھا نہ تاؤ اپنی جوتی اتار کر اتنے زور سے اس کے منہ پر دے ماری کہ بے چارے کی آنکھ پھوٹ گئی۔"(۱۱)

گھر سے دی گئی آزادی نے اس کے اندر خود اعتمادی بڑھادی تھی اور یوں وہ گاؤں کی عام لڑکیوں کی طرح ڈرپوک نہیں تھی۔ نہ ہی اس کے اندر ثقافتی مروت اور لحاظ تھا جب وہ لڑ کر گھر آئی تو اُسے قطعاً یہ احساس نہیں تھا کہ اس کی وجہ سے اس کے باپ کی سبکی ہو گی۔ کیونکہ گاؤں میں عمومی طور پر لڑکیاں ایسی باتوں کو عزت کا خیال و پاس کرتے ہوئے نظر انداز کر دیتی ہیں۔

ناول کے ہیرو سے شادی کا فیصلہ بھی حاجرہ کا ذاتی تھا۔ وہ پسند کی شادی کی حامی تھی اس کے خیال میں زندگی کے اس اہم فیصلے کو انسان کو خود کو ہی کرنا چاہیے۔ وہ ایسے ہی آزاد خیال مرد سے شادی بھی کرنا چاہتی تھی جو ہم خیال ہونے کے ساتھ ساتھ علم و ادب سے بھی لگاؤ رکھتا ہو۔ شادی کے کچھ عرصہ بعد جب اس کے کہنے پر جندروئی نے جندر نہ چھوڑا تو اس نے علیحدگی کا فیصلہ کر لیا۔ اور یہ فیصلہ بھی اس نے خود کیا اور پوری زندگی اپنے بیٹے کے ساتھ گزار دی۔ جندروئی کے ساتھ ہونے والی ایک تکرار میں اس نے اپنے خیالات کا اظہار یوں کیا۔ "میں نے ایک آزاد مرد سے شادی کی تھی مجھے کیا پتا تھا کہ وہ جندر کی گونج کا قیدی ہے۔ میں ایک معذور مرد کے ساتھ تو زندگی گزار سکتی ہوں لیکن ایک مجبور مرد کے ساتھ نہیں۔"(۱۲) ثقافتی حوالے سے اہم کردار جندروئی کی بیوی حاجرہ کا ہے جو نڈر اور بے باکی ہونے کے ساتھ ساتھ وہ ایک مشرقی عورت کی زندگی کی کشمکش کی بھی نشاندہی کر رہی ہے۔ جو اپنی محنت، خلوص اور محبت کے بعد بھی آخر میں اکیلے زندگی گزار دیتی ہے یعنی ناکام ہو جاتی ہے لیکن اس تمام تر صورت حال کے بعد بھی وہ جھکنے سے انکار کر دیتی ہے اور آزاد مرد کے ساتھ زندگی گزارنے کا اظہار کرتی ہے اسے جندروئی کی جندر کی کوک کا قیدی ہونا انتہائی ناگوار گزرتا ہے جس کی وجہ سے علیحدگی کا فیصلہ کرتی ہے۔ فریدہ حفیظ نے اختر رضا سلیمی کے اس کردار کے حوالے سے اپنے مضمون میں لکھا ہے۔

"جندر کا دوسرا اہم ترین کردار جندروئی کی بیوی کا ہے ایک طرف جندر زندگی کی علامت ہے اس کا قیام انسانی تہذیب کے قیام کی کہانی ہے خود جندروئی صدیوں کی

تہذیب اور تمدن اور اخلاقی اقدار کی ٹھوٹ پھوٹ کی علامت ہے اور جندروئی کی بیوی
ہاجرہ معاشرتی ٹوٹ پھوٹ کے آگے ہتھیار ڈالنے سے انکار کر دیتی ہے۔"(۱۳)

جندروئی کے خیال میں گاؤں سے مضبوط رشتہ ہونا بہت ضروری ہے اور گاؤں میں شرکت کے لیے اور اس سے تعلق مضبوط کرنے کے لیے وہاں کے تمام رسومات و اقدار میں بڑھ چڑھ کر کام کرنا بہت ضروری ہے اس لیے وہ زیادہ تر وقت جندر پر گزارنے کے باوجود گاؤں کی رسومات میں باقاعدگی سے شریک ہوتا تھا اسے ڈر تھا کہ اس کا حال اس کے ماموں جیسا نہ ہو جو پڑھ لکھ کر گاؤں سے رشتہ توڑ کر شہر چلا گیا اور آخر اس کی موت پر اس کے قبر کھودنے کے لیے اس کے بیٹوں اور جندروئی کے علاوہ کوئی نہیں تھا۔

ب: جغرافیائی مآخذ کے ثقافتی عناصر

i. لباس

ثقافتی مظاہر کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ ثقافتی مادی حصہ اور غیر مادی حصہ، مادی حصے میں وہ تمام اشیاء شامل ہیں جو ہمیں باقاعدہ حواس سے محسوس ہوتی ہیں جن میں ہاتھ سے بنی ہوئی چیزیں، عام گھریلو استعمال کی چیزیں، ذرائع نقل و حمل اور دیگر مشینری کی اشیاء شامل ہیں۔ غیر مادی حصے میں اقدار و روایات، رسوم و رواج، آداب معاشرت، میل جول، لوک روایات، علوم و فنون عقلی اور فکری ادب کا سرمایہ شامل ہے۔

ثقافت کے غیر مادی عناصر کو بسا اوقات انسانی ترقی کا ثبوت نہیں سمجھا جاتا ہے جس طرح کسی مادی عنصر کو سمجھا جاتا ہے۔ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ مادی مظاہر مصنوعات مشینری کی شکل میں واضح طور پر دیکھے جاسکتے ہیں اور ان کی باقاعدہ افادی حیثیت بھی ہے۔ دوسری اہم وجہ یہ ہے کہ ایک خودکار مشین خود بخود کسی ماورائی قوت کے بل بوتے پر نہیں ایجاد ہوتی ہے بلکہ اس کے پیچھے ایک مسلسل سلسلہ ایجادات ہوتا ہے اور انسانی تدبیر کاریوں کے ہاتھوں ہی درجہ کمال تک پہنچتی ہے۔ اس کے باوجود ثقافت کے غیر مادی مظاہر کو

انسانی ترقی کی تاریخ سے خارج نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ اس میں انسانی کوششوں کا عمل دخل ہوتا ہے۔ اس کی افادی حیثیت متنازعہ ہو سکتی ہے لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ رسوم و رواج کے ساتھ ساتھ آداب معاشرت کی شکل میں ایسی کئی صورتیں ہیں جو ماورائی اعتقادات کے پس منظر ایک طویل انسانی تجربے کا نچوڑ ہیں ۔ جس طرح مادی مظاہر کا ایک طویل تجربات اور تدبیر کا سلسلہ نظر آتا ہے اسی طرح غیر مادی مظاہر جو فضا اور ماحول کو تعمیر کرتے ہیں کا بھی ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ نظر آتا ہے۔ جو مادی فروغ کی ترقی کے لیے بہت اہم ہے۔ E.B Taylor نے کلچر کے لفظ کی ایک با قاعدہ تعریف بیان کی جس سے اس کے مفہوم کو سمجھنا آسان ہو گا۔

> "کلچر، علوم و فنون، عقائد و رسوم، اخلاقیات، قوانین، عادات و اطوار سے مملو وہ طرز زندگی ہے جس کا اکتساب انسان معاشرے کے فرد کی حیثیت سے کرتا ہے۔"(۱۴)

ثقافت کے لیے مختلف تنقید نگاروں نے کلچر کا لفظ استعمال کیا ہے۔ ثقافت کا تعلق رسوم و رواج، رہن سہن، اخلاقی اقدار، مذہبی رسوم سے ہے۔ تنہا فرد دنیا میں ترقی نہیں کر سکتا بلکہ اس کے ساتھ ساتھ ارد گرد معاشرے کا ایک حساس طبقہ ہوتا ہے وہ معاشرتی تبدیلیوں کو نہ صرف اپنی ذات کا حصہ بناتا ہے بلکہ اپنے اندر سموتے ہوئے اپنی تخلیقات میں بھی جگہ دیتا ہے اور پھر یہ موضوع عوام الناس کی بحث کا حصہ بنتا تو یہ اجتماعی غم کی صورت اختیار کر جاتا ہے۔ دنیا میں ایسا کوئی معاشرہ نہیں ہے جہاں ادب کا حصہ تہذیب و ثقافت نہ ہو۔ تہذیب و ثقافت میں گاؤں کے ماحول اور کردار سے لے کر تمام پہلو زیرِ بحث لائے جاتے ہیں خواہ وہ رسم و رواج ہو یا اساطیر۔

شیما مجید ایک جگہ لکھتی ہیں:

> "ہر قوم کی ثقافت اور اس کے معیاری عناصر کا تعین اور اس کے تشخص کے مسائل ایک دوسرے سے وابستہ ہیں۔ ہماری دانست میں ثقافت ایک ایسی ہمہ گیر اصطلاح ہے جو ہماری زندگی کے تمام پہلوؤں پر محیط ہے اور اسی انسان نے ثقافت کے جوہر سے ہمارا تشخص پہید کیا ہے۔"(۱۵)

کسی بھی ملک یا قوم کی پہچان اس ملک یا علاقے کی ثقافت کو جانے بغیر ممکن نہیں۔ اسی طرح جس معاشرے کی ثقافت کو اختر رضا سلیمی نے جندر میں بیان کیا ہے۔ وہ ہماری قوم کی پرانی ثقافت ہے جو ہمیں اصل میں اپنے آباؤاجداد کے ذریعے ورثے میں ملی ہے۔ اس معاشرے میں مذہب اسلام کی واضح چھاپ نظر آتی ہے اور اس کے ساتھ مختلف رسوم و روایات، طرز زندگی، لباس، خوراک، فنون، غذائیں، میلے ٹھیلے اور عرس، کھیل اور تہوار وغیرہ پائے جاے ہیں جو تمام ایک مخصوص ثقافت کی نمائندگی کرتے نظر آتے ہیں۔

اس علاقے کی عوام کے لباس میں مختلف قسم کے انداز پائے جاتے ہیں اس علاقے میں لوگ اپنی روایات اور موسم کے مطابق لباس زیب تن کرتے ہیں۔ اس علاقے کو لباس موسم کے ساتھ ساتھ مذہبی ضرورتوں کو بھی پیش نظر رکھتے ہیں۔ گاؤں میں بزرگ زیادہ تر دھوتری، پگڑی یا سر پر صافہ باندھتے تھے۔ یہ گاؤں کے لوگوں کی نمائندگی کرتی ہے۔ لباس اور آرائش وزیبائش کے لیے جو فرد زیب تن کرتا ہے وہ اصل میں اپنے علاقے کی تہذیب و ثقافت کی نمائندگی کرتی ہے۔ جندر میں بھی اختر رضا سلیمی لکھتے ہیں: "ان کا لباس پھٹا پرانا اور میلا تھا اور انہوں نے سر پر بزرگوں کی طرح میلی کچیلی پگڑیاں باندھی ہوتی تھیں اپنی عمر سے بڑے لگنے میں ان کی ان پگڑیوں کا بھی ہاتھ تھا۔"(۱۶) گاؤں کی ثقافت میں وہ بزرگ یا جاگیر دار اور وہ بزرگ جو پنچایتوں میں شرکت کرتے ہیں وہ زیادہ تر سر پر پگڑی باندھتے ہیں گاؤں میں پگڑی کا عزت و آبرو کی علامت سمجھا جاتا ہے اور زیادہ تر بڑی عمر کے مرد پگڑی باندھتے ہیں۔ گاؤں کے لباس میں پگڑی کو خصوصی اہمیت حاصل ہے اور یہ گاؤں کے معاشرتی ثقافت میں بنیادی حیثیت کی حامل ہے۔

گاؤں میں مخصوص ادارے یا مدرسے میں پڑھنے والے طالب علم کے ساتھ ساتھ بچے کو دیکھ کر اندازہ لگایا جاتا ہے کہ وہ بچہ کسی ادارے سے منسلک ہے۔ اکثر اوقات گاؤں میں سکول کے لیے کوئی خاص قسم کا لباس مخصوص نہیں کیا جاتا ہے لیکن یہ ناول جس ثقافت کے پس منظر میں لکھا گیا وہ اداروں میں کسی حد تک جدید اصولوں سے بھی آگاہ تھے۔ ناول "جندر" میں مصنف لکھتے ہیں "جندر کے کمرے کے ساتھ ایک پسار بھی ڈال دیا جس کا مصرف یونیفارم اور بستہ لٹکانا تھا۔"(۱۷) ہزارہ میں بھی سکول جانے والے بچوں کے لیے ایک مخصوص لباس متعین کیا گیا تھا جو اس کی پہچان تھا۔ مرد اور عورت کی تخصیص روزازل سے جاری ہے۔ اسی

تخصیص کے ساتھ ساتھ دنیا کے تمام آرائش وزیبائش میں بھی فرق ہوتا ہے۔ مردوں کے کپڑے سادہ ہوتے ہیں لیکن چونکہ عورتیں بناوٹ اور جدید ڈیزائن زیادہ پسند کرتی ہیں اسی طرح مذہبی لحاظ سے مردوں کو عورتوں جیسے لباس پہننے سے ممانعت ہے اور ہمارے تمام ثقافتی ورثے میں مذہب چونکہ بنیادی حیثیت کا حامل ہے اس لیے کپڑوں میں مردوں کے لباس میں پگڑی، کُرتا، دھوتی، صافہ اور عورتوں کے لباس میں پھول دار کپڑے، چادریں وغیرہ عام ہیں۔ زنانہ کپڑوں میں سب سے اہم جزو شلوار قمیض، دوپٹہ جو مذہب کے ساتھ ساتھ ثقافتی ضرورتوں کو بھی پورا کرتا ہے۔ اختر رضا سلیمی نے "جندر "میں مردوں اور عورتوں کے کپڑوں کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

> "میں بازار گیا تو احتیاطاً زنانہ کپڑا بھی لے آیا تھا تاکہ اگر لڑکی پیدا ہو تو وقتی طور پر پریشانی نہ اٹھانا پڑے۔ لڑکی کے کپڑے کیوں لے آئے ہو؟ اس نے میرے ہاتھ میں زنانہ کپڑے دیکھتے ہی کہا تھا۔ اس کے لہجے میں سخت برہمی اور غصہ تھا۔ میں نے زندگی میں پہلی دفعہ اسے اتنے غصے میں دیکھا تھا۔ اس نے پھول دار زنانہ کپڑے، میرے ہاتھ سے لے کر زمین پر پٹخ دیے تھے اور مردانہ کپڑا سینے سے لگا لیا تھا، جو اگلے دو ہی دنوں میں تمہارے ننھے منے جوڑوں کی شکل اختیار کر چکا تھا۔"(۱۸)

گاؤں کی ثقافت میں مردوں اور عورتوں کے لباس کے ساتھ ساتھ کپڑوں میں بھی واضح فرق ہوتا ہے۔ عورتوں کے کپڑے چھینٹ والے اور مردوں کے سادہ رنگوں میں ہوتا ہے۔ زیادہ تر بزرگ سفید لباس پہنتے ہیں۔ اختر رضا سلیمی نے بھی جس لوکیل میں یہ ناول لکھا وہاں بھی اسی طرح لباسوں کی تخصیص تھی جس کا ذکر انہوں نے ناول میں کیا۔

گاؤں میں زیادہ تر مرد اپنے کندھوں پر چادر رکھتے ہیں وہ چادر زیادہ تر سفید رنگ کی ہوتی ہے۔ سر پر صافہ نوجوان لڑکے اور مرد بھی باندھ لیتے ہیں اور اس صافہ کو وہ کھول کر کندھے پر بھی رکھ لیتے ہیں یہ خالصتاً گاؤں کی ثقافت ہے۔ ناول "جندر "میں اختر رضا سلیمی نے اس کا ذکر یوں کیا ہے:

"جس کے دندانوں پر اپنی پہلے ہی پھیری جا چکی ہوتی، نکالتا اندھیرے میں اس کے دندانوں پر ہاتھ پھیر کر ان کی دھار کو محسوس کرتا، اپنا صافہ مونڈے پر رکھتا اور جندر کے بوہے کو جندر اچڑھا کر گاؤں کی راہ لیتا۔"(۱۹)

گاؤں میں صافہ، دھوتی اور اس طرح کے لباس شلوار قمیض یہ ثقافت زیادہ تر دیہات میں ہی نظر آتی ہے۔ ہزارہ میں بھی لوگ قمیض لیتے اور کندھے پر صافہ رکھتے ہیں جس کے لیے کوئی مخصوص رنگ نہیں ہے بلکہ وہ خاصا بڑا کپڑا ہوتا ہے جس کو وہ بطور چادر بھی استعمال کرتے ہیں اور بوقت ضرورت پگڑی بھی بنا لیتے ہیں عموماً موسم گرما میں صافہ استعمال کیا جاتا ہے۔ چونکہ وہاں کی ثقافت کا اہم پہلو ہے اسی لیے اختر رضا سلیمی نے اس کا بطور خاص ذکر کیا۔

ii. بود و باش

ثقافت کسی بھی قوم کی معاشی و معاشرتی اقدار، روایات اور بود و باش کی عکاسی کرتا ہے۔ کچھ اقوام کی ثقافت دوسرے علاقوں سے اس قدر الگ ہوتی ہیں کہ وہ واضح طور پر پہچانی جا سکتی ہیں ان کے اقدار روایات کے ساتھ ساتھ ان کی بود و باش میں بھی واضح فرق نظر آتا ہے۔ ثقافت کی پہچان کے لیے ماحول اور مذہب دونوں ساتھ ساتھ رواں دواں ہوتے ہیں۔ رہن سہن، بود و باش، ماحول، اخلاقی اقدار یہ تمام مل کر ہی ثقافت کا پتا دیتی ہیں مثلاً ایسا ممکن نہیں ہے ایک فرد اپنا سر منڈوا کر ماتھے پر زعفرانی رنگ سے لکیریں لگائے اور گلے میں گیارہ مختلف رنگوں کے دھاگے لٹکا کر اور ماتھے کے عین وسط میں بندیا لگا کر اسلامی معاشرے میں کسی بھی مسجد کے امام یا شیخ الحدیث ہونے کا دعویٰ کرے اسی طرح انسان کی ظاہری رنگ ڈھنگ، انداز و اطوار بھی اصل میں اس کی ثقافت سے آگہی دیتے ہیں اس طرح ایک مسلمان شخص مغرب کے کسی ملک امریکا، جرمنی، چینی، فرانس میں زیر سفر ہو اور وہ کسی ریستوران میں جا کر محض حرام و حلال کی تخصیص کی وجہ سے کھانا نہ کھائے اور دودھ اور سوکھی روٹی پر اکتفا کر لے یہ عمل بھی اس کی ثقافتی اقدار اور رہن سہن کا پتا دیتی ہے۔ اپنی اسی ثقافتی اقدار کی پاس داری اور شناخت اس کے فخر اور کبھی کبھار ایک مضحکہ خیز عمل کی صورت اختیار کر

جاتا ہے لیکن اس کے باوجود وہ مضحکہ خیزی بھی اپنے اندر ایک اہم پیغام رکھتی ہے۔ اور زندگی میں اس جزوی تشخص کا اہتمام انسان کے اندر خیر و شر کی کش مکش کی کیفیت پیدا کر دیتا ہے۔

۱۸۵۷ء کی ناکام جنگ آزادی کے دوران جب اسد اللہ خان غالب کو ثقافتی و تہذیبی تشخص کے حوالے سے ایک انگریز کرنل کے سامنے مسلمان ہونے کے جرم میں پیش کیا گیا اس نے پوچھا کہ کیا تم مسلمان ہو، جو تو مرزا نے انتہائی معنی خیز جواب دیا کہ جناب میں ۵۰ فیصد مسلمان ہوں۔ انگریز نے حیرت سے استفسار کیا کہ اس بات کا مطلب کیا ہے۔ تو مرزا نے جواب دیا کہ جناب شراب پی لیتا ہوں مگر کبھی سور کا گوشت نہیں کھایا۔ یہاں مرزا نے اپنا شخصی اظہار انتہائی فصیح و بلیغ انداز میں کیا یہ جواب ان کا اپنی ذات کے بارے میں تصور تھا کہ وہ بنیادی طور پر مذہب اسلام پر ایمان رکھتے ہیں اور ثواب و زاہد سے بھی بخوبی واقف ہیں۔ اس بات پر فخر بھی ہے لیکن اپنی طبیعت سے مجبور ہو کر بسا اوقات بھٹک بھی جاتے ہیں۔ ایسے معترضہ جملے سے مراد یہ ہے کہ دراصل تہذیبی و ثقافتی تشخص کا تعلق انسان کی تصور حیات سے ہوتا ہے۔ انسان غیر محسوس طریقے سے اس ماحول اور فضا کا عادی ہو جاتا ہے۔ اس طرح ناول میں جندروئی جس ماحول اور فضا میں پرورش پا رہا تھا وہاں کے لوگوں کے ماحول میں یہ بات لازمی سمجھی جاتی تھی کہ وہ کھیتی باڑی سے کسی نہ کسی صورت منسلک رہیں اور کھیتی باڑی کو اولین ترجیح دیں۔

ناول میں جس گاؤں کی ثقافتی ماحول اور رہن سہن کو بیان کیا ہے جندروئی اس کا مرکزی کردار ہے۔ وہ اس ناول میں موجودہ ماحول میں رہنے والے لوگوں کے رہن سہن ان کے اخلاق و اطوار کو بیان کر کیا ہے۔ گاؤں کے ہاں کھیتی باڑی نہ کرنے والے شخص کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتے تھے ان لوگوں کا خیال تھا کہ زمین میں ہل نہ چلانے والا شخص اصل میں زمین سے بے وفائی کر رہا ہے۔ اسی ثقافتی رہن سہن کو اختر رضا سلیمی نے "جندر" ناول میں یوں بیان کیا ہے:

> "ان دنوں گاؤں والوں میں سے اکثر کی گزر اوقات کا واحد ذریعہ کھیتی باڑی ہوتا تھا اور اگر کسی سال کوئی شخص کسی وجہ سے بوائی نہ کر سکتا تو اسے زمین سے بے وفائی کا طعنہ دیا

جاتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان دنوں وہ لوگ بھی جن کا ذریعہ معاش کچھ اور ہوتا، سال میں دو مرتبہ اپنی زمین پر ہل ضرور چلاتے تھے تاکہ زمین سے بے وفائی کے مرتکب نہ ہوں۔"(۲۰)

گاؤں کے ہاں یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اگر کوئی شخص شہر میں روزگار یا کسی غرض سے کوئی اور کاروبار کرلے تب بھی وہ کھیتی باڑی میں اپنا حصہ ضرور ڈالے ایسے لوگ بے شمار تھے جو صرف گاؤں سے اپنا تعلق قائم رکھنے کے لیے کھیتی باڑی اور زمین سے اپنا رشتہ جوڑے رکھنے کے لیے وہ زمین میں ہل ضرور چلاتے اور اکثر اوقات اس عمل سے ان کا نقصان بھی ہو جاتا۔ لیکن چونکہ خاندانی روایات کو قائم رکھنے کے لیے وہ کھیتی باڑی میں شراکت داری ضرور کرتے کیونکہ ان لوگوں کا خیال تھا کہ یوں گاؤں سے ان کا رشتہ جڑا رہے گا اور گاؤں کے لوگوں سے ان کے تعلقات استوار رہیں گے۔

"رکھوالی نہ کرنے کی وجہ سے اول تو زمین میں بیجا گیا دانہ پرندے چگ جاتے تھے۔ اور اگر زمین سے کچھ پھوٹ بھی نکلتا تو اسے اڑوس پڑوس کے مال مویشی تباہ کر کے دیتے تھے۔"(۲۱)

جب ہل چلانے کے بعد وہ بوائی کر کے داناڈال دیتے اور اس کی دیکھ بھال اور رکھوالی نہ کرنے کی وجہ سے نقصان بھی ہو جاتا لیکن تمام نقصانات کی پرواہ کیے بغیر وہاں کے لوگ کھیتی باڑی کرتے تھے۔ وہاں کے لوگ کھیتی باڑی کے ساتھ ساتھ پالتو جانوروں میں گائے، بکریاں، بھیڑیں، کتے اور بلّیاں کو بھی پالتے ہیں۔ گاؤں میں اٹھنے والی جگہ جگہ سے جانوروں کی بو وہاں کے رہن سہن کا بنیادی حصہ ہے۔

گاؤں میں اگر کوئی فوت ہو جائے تو کئی دنوں تک ایک ماتم کا سماں رہتا ہے اور وہاں پر روزانہ عورتیں جمع ہوتی ہیں اور آنے والے تمام مہمانوں اور لوگوں کے کھانے پینے کے حوالے سے خصوصی خیال رکھا جاتا ہے۔ اور یوں گاؤں والے ایک جگہ مخصوص کر لیتے ہیں جہاں مرد جمع ہوتے ہیں اور فاتحہ خوانی کرتے ہیں اور اسی طرح عورتیں روزانہ آتی اور مرے ہوئے کے قریبی رشتہ داروں کو گلے لگا کر روتی ہیں اور بین کرتی ہیں

جس لوکیل میں یہ ناول لکھا گیا وہاں کے لوگوں کے ہاں بھی یہی رواج عام ہے جس کو اختر رضا سلیمی نے یوں بیان کیا ہے:

> " ان کے بچے یہاں آکر انسانوں سے زیادہ پڑوسیوں کے ڈھور ڈنگروں سے گھل مل جاتے ہیں اور بلی اور بکری وغیرہ کے بچوں کو تو پکڑ کر گود میں اٹھا لیتے ہیں ان کے لیے الگ سے درد سر ہوں گے کہ اس مصنوعی سوگوار ماحول میں، جب کہ ان کے پاس کئی دنوں تک تعزیت کے لیے آنے والوں کا تانبا بندھا رہے گا، ان پر کڑی نظر رکھنا ان کے لیے ناممکنات میں سے ہو گا ۔"(۲۲)

تمام گاؤں کی عورتوں کا یوں مسلسل آنا اور گھر والوں کو مسلسل غمگین رہنا وہاں کا عام رواج ہے اور ایسا ناممکن ہے کہ کسی مرے ہوئے گھر مرنے کے کئی دن بعد تک بھی صف ماتم نہ بچھی ہو۔ اقربا کو نہ چاہتے ہوئے بھی اداس اور غمگین و پریشان رہنے کی اداکاری کرنی پڑتی ہے ورنہ گاؤں کے آنے والی عورتیں ان کے بارے میں باتیں کرتی ہیں۔ یہی وہاں کا ثقافتی رہن سہن ہے۔

گاؤں میں لوگ لکڑیاں جنگلوں سے کاٹ کر لاتے ہیں اور پھر بطور ایندھن اس کو استعمال کرتے ہیں۔ گاؤں میں مردوں کے ساتھ ساتھ عورتیں بھی یہ کام بخوبی کرتی ہیں۔ کیونکہ گاؤں میں بجلی کی سہولت نہ ہوتے کی وجہ سے لوگ لالٹین جلاتے ہیں اور چونکہ وہ پہاڑی علاقہ ہے وہاں برفباری اور بارش کی وجہ سے درجہ حرارت نقطہ انجماد سے گر جاتا اور سردی زیادہ ہوتی ہے۔ وہاں چشمے ہونے کی وجہ سے لوگ تازہ پانی لاتے اور پینے والا پانی کولر کے بجائے گھڑوں میں رکھتے ہیں۔ وہ چشمے کا صاف و شفاف پانی استعمال کرتے ہیں وہاں ہر گھر میں نلکے یا کنویں وغیرہ کا رواج نہیں ہے پہاڑوں سے اور آبشاروں کے صاف پانی کے چشمے ہونے کی وجہ سے کوئی بھی گھروں میں کنواں نہیں کھودواتا بلکہ دور دراز چشموں سے پانی بھر کر لاتے ہیں اور کھانے پینے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ اسی طرح کی ثقافتی بود و باش کا ذکر اختر رضا سلیمی نے ناول "جندر" میں اس طرح بیان کیا ہے۔

" اندھیرے میں ٹٹول کر لالٹین تلاش کر کے اُسے روشن کرتا؛ پھر یہ سوچ کر کہ میں گہری نیند سویا ہوا ہوں، وہ باہر جا کر لکڑیاں اٹھالاتا، آگ جلا کر کچھ دیر ہاتھ تاپتا؟ چولہے کے کنارے رکھا گھڑا اٹھا کر باہر صحن کے ساتھ موجود کیاری میں اس کا پانی انڈیلتا اور سیدھا اس چشمے پر چلا جاتا۔"(۲۳)

جس دور کی ثقافت اختر رضا سلیمی نے بیان کی ہے وہ بہت قدیم دور ہے اس دور میں گھروں میں کھانے پکانے کے لیے کوئی گیس یا بازاری چولہا نہیں ملتا وہاں کے لوگ خود ہی گھروں میں آگ جلانے کے لیے پتھروں کا یا سیمنٹ کا چولہا بنالیتے ہیں اور گاؤں میں زیادہ لوگ اسی طرح کے تکون سے چولہے گارے مٹی یا پتھروں کا بناتے ہیں۔ صحن کا کوئی ایک کونا چولہے کے لیے مخصوص کر لیا جاتا اور پھر اسے ہی کھانا پکانے اور ہاتھ تاپنے کے لیے مخصوص کر لیا جاتا اور پھر وہاں ہی کھانا پکانے اور ہاتھ تاپنے کے لیے آگ بھی جلائی جاتی۔ مذکورہ گاؤں چونکہ پہاڑی گاؤں ہے پہاڑوں کے دامن کو کاٹ کر گھر بنائے جاتے اور پتھروں کا استعمال ہی زیادہ کیا جاتا اسی لیے وہاں چولہے بھی زیادہ تر پتھروں کے ہی بنائے جاتے۔ جیسے "جندر" میں ذکر ہے "صحن کے کونے میں پتھروں کا چولھا بنا کر آگ جلانے کی تیاریوں میں مصروف ہو جاتے۔"(۲۴) گاؤں کے لوگ سادہ غذا کھاتے ہیں اور دیسی چیزوں کو زیادہ پسند کرتے ہیں مثلاً دیسی گھی، مکھن، ساگ اور اس طرح کی سادہ غذاؤں کو ترجیح دیتے ہیں۔ وہاں پر لوگ دیسی مرغن غذاؤں کو استعمال کرتے ہیں۔ وہاں خاص قسم کے کھانے کسی خاص موقعے پر یا کسی خصوصی مہمان کی آمد پر بنائے جاتے ہیں۔

اکثر اوقات لوگ تلاش معاش کے لیے شہروں کا رخ کرتے ہیں لیکن جب وہ گاؤں واپس آتے تو وہ مرغن غذاؤں کے بجائے گاؤں کے دیسی کھانوں کو پسند کرتے ہیں اور فرمائشی کھانا بنواتے ہیں۔ گاؤں میں مہمان اور بڑے لوگوں کے لیے خصوصی کمرے بنوائے جاتے ہیں کیونکہ انہیں رہائشی کمروں میں بیٹھانے کو برا سمجھا جاتا۔ اسی طرح کے ماحول کا ذکر "جندر" میں اختر رضا سلیمی نے کیا ہے۔

" شام ڈھلے جب یہ قافلہ جندر کے پاؤں کی جوڑی لے کر واپس آیا تو ان کی خوب آؤ بھگت کی گئی۔ ان کے لیے دیسی گھی میں طرح طرح کے کھانے پکائے گئے اور خصوصی طور پر مٹھائی بھی تیار کی گئی۔ جب کھانے کی میز پر بیٹھنے کی باری آئی تو انھوں نے ان دونوں بھائیوں کو کھانے کے بڑے کمرے میں بیٹھانے کے بجائے باہر برآمدے میں بیٹھایا؛ اور خصوصی طور پر لگائے گئے کھانے کے بجائے انھیں لسی میں پکا ہوا ساگ اور مکئی کی روٹیاں دی گئیں ۔ انھوں نے خاموشی سے کھانا کھایا اور وہاں سے نکل گئے۔"(۲۵)

گاؤں کے بودوباش میں زیادہ تر لوگ لسی، دیسی گھی، ساگ اور اسی طرح کی سادہ غذائیں کھاتے ہیں۔ کیونکہ وہ پہاڑی علاقہ ہے وہاں سبزہ قدرے زیادہ ہوتا ہے۔ اسی لیے وہاں با آسانی تمام دیسی اشیاء اور دیسی سبزیاں دستیاب ہوتی ہیں جو ان کی ثقافتی و تہذیبی بودوباش کا حصہ ہے۔ اسی لیے ناول میں دیسی غذاؤں کو زیادہ بیان کیا گیا ہے کیونکہ وہاں کے لوگوں کی سادہ غذاؤں کے ساتھ ساتھ ان کے انداز و اطوار بھی سادہ ہوتے ہیں چونکہ وہ دونوں بھائی ہزارہ سے تعلق رکھتے ہیں اس لیے اپنی ثقافت، رہن سہن کو فراموش کیے بنا انھوں نے نیچے بیٹھنے کو ترجیح دی ان کے اس انداز کے ساتھ مہمان ہونے کے باوجود ان کے لیے خصوصی طور پر لسی کا ساگ بنایا گیا ہے اور گندم کی روٹی کے علاوہ مکئی کی روٹیاں پیش کی گئیں۔

iii. رسوم وروایات

رسوم وروایات سے کسی ملک یا قوم کا چال ڈھال، طور طریقے، آئین، ریت یا رواج مراد ہے۔ کسی بھی معاشرے میں جو رسم ورواج، طرز بودوباش، اخلاق وعادات، روابط وسلوک، اخلاقیات رائج ہوتی ہے وہ دراصل اس علاقے کی ثقافت ہوتی ہیں اور کسی بھی علاقے یا ملک کے لوگوں کی تشخیص کا بنیادی سرچشمہ انکی تہذیب و ثقافت اور اس کے اعلیٰ مظاہر اس کی خوبیاں ان کے اخلاق و آداب، رہن سہن، رسم و رواج، بودوباش، فن تعمیر اور روایات میں نظر آتے ہیں۔ یہی کسی ثقافت کی بنیادی چیزیں ہیں اور اس قوم کو بے باک

ونڈر، شجاع و غیور، قابل فخر اور خود مختار بناتی ہیں۔ مختلف علاقوں میں مختلف قسم کی رسم و رواج پائے جاتے ہیں۔ شادی بیاہ سے لے کر بچوں کی پیدائش اور اموات تک متعدد ایسی رسمیں ہیں جو باقاعدگی سے ادا کی جاتی ہیں۔ مختلف گاؤں اور ان کے مصافات میں میلے اور عرس منعقد کیے جاتے ہیں جو ثقافت کی عکاسی کرتی ہیں عرسوں میں حضرت خواجہ فرید الدین شکر گنج، نظام الادین اولیاء، داتا گنج بخش علی ہجویری وغیرہ کے عرس شامل ہیں اور مختلف رسومات میں شادی، منگنی، مہندی، ڈولی میں اٹھا کر لڑکی کو لانا، گود بھرائی، بچے کا نام رکھنا، اس طرح کی مختلف رسومات شامل ہیں۔ رسم سے مراد وہ روایت ہے جو پرکھوں سے چلی آرہی ہے اس میں فائدہ یا نقصان نہیں دیکھتے اور یہ کیوں ہے؟ یہ سوال بھی کوئی نہیں کرتا۔ رواج بھی اسی کا نام ہے کہ سب لوگ بغیر کسی حیل و حجت کسی چیز کو قبول کے کرنے لگیں اور اس کو کرنے میں کوئی عار محسوس نہ کریں یا وہ کام کرتے ہوئے انہیں معیوب نہ لگے۔ سر سید احمد خان نے اپنی ایک تقریر میں رسم کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے کہا:

> "سر والٹر ریلی نے نہایت عمدہ بات کہی ہے کہ رسم اور رواج میں وہ فرق ہے جو سبب اور نتیجے میں ہے، کیوں کہ جس کام کا رواج موت تک رہتا ہے تو وہ بطور قانون کے لوگوں میں پھیل جاتا ہے اور آخر کو یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ وہ ایک رسم بن جاتی ہے۔"(۲۶)

رسم در حقیقت میں ایک ایسا قانون ہے جو کبھی تحریر میں نہیں آتا ہے لیکن تمام لوگ اس کو من و عن قبول کرتے ہیں اور مدتوں تمام لوگوں کی باہمی رضامندی سے چلتا رہتا ہے۔ رسم و روایات کے حوالے سے بات کرتے ہوئے شاہد احمد رزاقی نے اپنی کتاب میں لکھا ہے:

> "کسی معاشرے کو نئے سانچوں میں ڈھالنے کے لیے رسم و رواج کی اصلاح ناگزیر ہو جاتی ہے۔ ہر قوم میں اچھی رسمیں زیادہ ہوتی ہیں اور بُری بہت ہی کم لیکن اس کے برعکس مردہ اور زوال پذیر قوموں میں بُری رسمیں تو کثرت سے ہوتی ہیں اور اچھی برائے نام۔"(۲۷)

مختلف گاؤں میں تمام رسومات یوں ہی ان کی عادت کا حصہ بن جاتی ہیں اور اس رسم کو اچھا سمجھانے لگتے ہیں حالانکہ مذہب میں ایسی رسومات کے حوالے سے کوئی دلیل نہیں ملتی لیکن چونکہ وہ رسم باقاعدہ رواج پاچکی ہوتی ہے اس لیے وہ اس رواج محض کو عادت پڑ جانے کی وجہ سے بھی نبھاتے ہیں اور اس پر عمل کرنا اپنے لیے فرض عین سمجھتے ہیں بعض ایسی رسومات ہوتی ہیں جن کی تقلید کرنا اور ان پر عمل کرنا کوئی معیوب کام نہیں ہوتا بلکہ وہ تمام انسانوں کے بھلے کے لیے ہوتی ہیں اور ان میں شرکت کرنا تمام انسانوں اور پورے گاؤں کو جوڑے رکھنے کے لیے ہوتی ہے۔ "جندر" میں بھی اختر رضا سلیمی نے ایسی رسم کا ذکر کیا ہے۔

> "اگرچہ گاؤں میں میری زرعی زمین نہ ہونے کے برابر تھی اور میں اس کی بوائی اور کٹائی کا کام تن تنہا بھی کر سکتا تھا لیکن اس کے باوجود فصلوں کے موسم میں مجھے لوگوں کی لیتریاں نکالنے، ہر حال گاؤں جانا پڑتا تھا۔ ان دنوں لیتریوں کے بغیر گاؤں کی زندگی کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ گاؤں کی تمام فصلوں اور گھاس وغیرہ کی کٹائی اور گاہی لیتری کی صورت میں مشترکہ طور پر ہوئی تھی۔ فصلیں تیار ہوتے ہی گاؤں کے تمام افراد مل کر گاؤں کے ایک سرے سے ان کی کٹائی بلا تفریق شروع کرتے اور ہفتہ، دس دنوں میں پورے گاؤں کی فصلوں کا صفایا کر دیتے تھے۔ کٹائی کا موسم شروع ہوتے ہی گاؤں کے وہ لوگ بھی جو نوکری پیشہ ہوتے یا کاروبار اور محنت مزدوری کرنے شہر گئے ہوتے؛ گاؤں پلٹ آتے اور لیتری میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے۔ لیتری سے غیر حاضری کو اچھا نہیں سمجھا جاتا تھا اور جو شخص بغیر کسی مجبوری کے مسلسل تین لیتریوں سے غائب ہوتا نہ صرف اس کی فصل کھڑی گلی سڑتی رہتی بلکہ وہ گاؤں میں تنہا بھی رہ جاتا تھا۔"(۲۸)

لیتری میں تمام لوگ جمع ہو جاتے ہیں اور مل کر تمام گاؤں والے ایک دوسرے کی فصل کی کٹائی اور گاہی کرتے ہیں جو لیتری میں غیر حاضر ہوتا تمام لوگ اس سے تعلق توڑ لیتے ہیں۔ جنازہ میں غیر حاضری قابل معافی سزا ہے لیکن لیتری میں نہ آنے والے کو اس سے بڑے جرم کا مرتکب سمجھا جاتا ہے۔ لیتری میں کام کرنے والے کی تواضع ایک گھر کے ذمے لگا دی جاتی ہے اور تمام لوگ اس کا خرچ برابر تقسیم کر لیتے ہیں۔ یہ ایک

ایسی رسم ہے جس نے گاؤں کے تمام لوگوں کو ضرورتاً ایک دوسرے سے جوڑ دیا ہے اور یوں تمام گاؤں کے لوگ ایک دوسرے کے حالات واقعات سے باخبر رہتے ہیں۔

گاؤں میں اسی لیے تمام لوگ ایک دوسرے سے جڑے رہتے ہیں اور جس علاقے کی ثقافت "جندر" میں بیان کی گئی ہے اس علاقے کے لوگوں نے بھی اسی طرح کی رسوم بنا رکھی تھیں تاکہ تمام لوگوں کا آپس میں تعلق بنائے رکھیں۔ اسی طرح کی ایک رسم جسے "پہوچی" کی رسم کہا جاتا ہے۔ اس کا ذکر ناول "جندر" میں ہے:

> "مکان کی تعمیر کا سب سے اہم مرحلہ جنگل سے بھاری کڑیاں اور بالے اٹھا کر لانا اور پھر چھت پر مٹی ڈالنا ہوتا تھا۔ کڑیاں لانے کے لیے لوگوں کی ایک پوری ٹولی جنگل کا رخ کرنے اور بھاری کڑی کے دونوں سروں پر کاہو کے مضبوط ڈنڈے باندھ کر آدمی اسے اٹھاتے اور چل پڑتے جوں ہی ان میں سے کوئی آدمی تھکتا کوئی دوسرا اپنا کندھا بڑھا دیتا اور پہلا کڑی کے نیچے سے ایک طرف سرک جاتا۔ مٹی ڈالنے کے عمل کو پہوچی کہا جاتا تھا۔ پہوچی میں گاؤں کے ہر گھر سے ایک آدمی ضرور شرکت کرتا۔"(۲۹)

گاؤں میں لیتری اور پہوچی اور یوں ہی مختلف کاموں کے لیے مثلاً مکئی کی کاشت کے لیے بھی پورا گاؤں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتا تھا اس دور میں چونکہ کچے مکانوں میں لوگ رہا کرتے تھے اور دیواروں کی چنائی سے لے کر فصلوں کی کٹائی تک ہر کام میں سب لوگ ایک دوسرے کی مدد کرتے تھے۔ یوں ان مختلف ثقافتی رسموں نے تمام گاؤں میں اتفاق و اتحاد قائم رکھا تھا۔ انہیں رسموں کی غیر حاضری کا ذکر کرتے ہوئے اختر رضا سلیمی نے ناول "جندر" میں لکھا ہے:

> "یہاں تک کہ گاؤں کے مولوی صاحب ان لوگوں کو تو معاف کر دیتے تھے جو صرف نماز عید پڑھنے سال کے بعد مسجد کا رخ کرتے لیکن لیتری سے غیر حاضر ہونے والوں کو یوں دیکھتے تھے جیسے وہ کافر ہوں۔"(۳۰)

لوگوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں رسم و رواج کو اولین ترجیح حاصل ہے وہ ان تمام رسموں کو ایک خاص انداز میں بیان کرتے ہیں۔ ہر رسم کے آغاز کے اپنے طریقے اور اصول ہوتے ہیں۔ وہ ان رسموں کے آغاز میں کچھ ایسے رواج جو ان کی ثقافت کا حصہ ہوتے ہیں ان کو اپناتے ہیں مثلاً لیتری کا آغاز بھی ایک خاص انداز میں کرتے ہیں مثلاً ڈھول بجانا، تمام لوگوں کو مسجد میں بلانا یا اس طرح کے کچھ اصول ہیں جن کو مدِ نظر رکھتے ہوئے رسموں کو برتتے ہیں۔

نکاح کرنا سنت ہے اور یوں شادی ایک مذہبی رسم ہے اور اس رسم میں بہت سی ایسی رسومات جو اس رسم سے منسلک کر دی گئی ہیں مثلاً اگر رشتے طے کر دیا جائے تو اس دن کو منگنی کا نام یا دعائے خیر کا نام دیا جاتا ہے جس میں تمام عزیز و اقارب کو باقاعدہ بلایا جاتا ہے اور اس کو بھی ایک باقاعدہ معاشرتی رسم کے طور پر ادا کیا جاتا ہے اسی رسم کا ذکر "جندر" میں یوں ہے "بھوک اور افلاس کی کثرت کے باعث زیادہ تر والدین رشتہ طے کرتے ہوئے صرف یہ دیکھتے تھے کہ ان کی بیٹی کو کہاں بہتر نان نفقہ ملے گا۔"[۳۱] گاؤں میں مقامی رسم و رواج نسبتاً زیادہ ہوتے ہیں۔ وہاں لڑکی اور لڑکے کے والدین کی باہمی رضامندی سے رشتہ طے ہوتا ہے اس میں شادی کرنے والے پیشہ ور شامل نہیں ہوتے بلکہ اپنے عزیز و اقارب، قریبی رشتہ دار اور دوست احباب ہی موزوں رشتہ کی نشاندہی کرتے ہیں اور اگر دونوں رضامند ہوں تو رشتہ طے ہو جاتا ہے۔

ہر خطے میں قبر کی اہمیت اپنی جگہ موسوم ہے لوگ قبروں کا بہت احترام کرتے ہیں اور ان کی حفاظت کے لیے مختلف اقدامات کرتے ہیں مثلاً قبر خراب ہو کر ٹوٹ پھوٹ کا شکار نہ ہو وہ قبر کی بہت حفاظت کرتے ہیں قبر کی حفاظت کے لیے ایک مخصوص فرد متعین کیا جاتا ہے جو قبرستان میں موجود تمام قبروں کی حفاظت کرتا ہے اسی طرح ہر علاقے میں قبروں کی حفاظت مختلف انداز میں کی جاتی ہے۔ ناول "جندر" میں اختر رضا سلیمی نے قبروں کی اہمیت کے ساتھ ساتھ اس علاقے میں قبر کی حفاظت کے حوالے سے یوں ذکر کیا ہے۔

> "صدیوں سے چلے آئے رواج کے مطابق اپنے عزیزوں کی قبروں کو اس کی دست برد
> سے بچانے کے لیے ان پر کانٹے دار درختوں، خاص کر جنڈی کی پھننگیں رکھتے ہیں اور

یہ پھننگیں اس وقت تک قبر پر موجود رہتی ہیں جب تک اسے با قاعدہ پکا کرنے کا بندوبست نہ کر لیا جائے۔"(۳۲)

جس علاقے کی ثقافت کو اس ناول میں مدِ نظر رکھا گیا ہے وہاں گاؤں والوں کے ساتھ ساتھ ان کی قبروں کا بھی خاص خیال رکھا جاتا ہے اور وہاں ایک با قاعدہ رواج ہے کہ عزیز و اقارب کی قبر پر لوگ فاتحہ خوانی کے علاوہ کانٹے دار درختوں کی پھننگیں رکھتے ہیں تا کہ ان کی قبر کی حفاظت ہو سکے اسی رواج کا ذکر اختر رضا سلیمی نے درج بالا اقتباس میں کیا۔

گاؤں میں اگر کوئی فوت ہو جائے تو مردہ کو کفنانا دفنانا مذہبی رسومات میں شامل ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ اور بہت سی معاشرتی رسومات بھی ہیں مثلاً قبر بنانا اسلامی رسم ہے لیکن قبر کی حفاظت کرنا معاشرتی رسم ہے اور اس معاشرتی رسم کو تمام لوگ اپنا فرض سمجھتے ہیں اور قبر کا با قاعدہ اہتمام کرتے ہیں یعنی اگر کوئی فرد فوت ہو جائے تو اس کے کفن دفن کا انتظام تمام لوگ مل کر کرتے ہیں۔ معاشرتی اور اسلامی ایسی تمام رسومات کو تمام لوگ مانتے ہیں اور اس پر عمل کرتے ہیں اسی طرح کی کچھ رسومات کا ذکر اختر رضا سلیمی نے "جندر" ناول میں کیا ہے:

"مجھے کچھ پتا نہیں کہ میں اُس کا آخری دیدار نہیں کر سکا تھا۔ جب اسے کفنا کر صحن میں دیدارِ عام کے لیے لایا گیا تھا تو میرا بہت جی چاہ رہا تھا کہ میں اسے دیکھوں کہ مرنے کے بعد اس کا چہرہ کیسا ہے۔"(۳۳)

گاؤں میں چونکہ تمام لوگ ہر دکھ سکھ میں ایک دوسرے کی غم و خوشی میں شریک ہوتے ہیں۔ تمام لوگ ذاتی طور پر بھی ایک دوسرے کے دکھ سکھ سے واقف ہوتے ہیں۔ یوں آپس میں حد درجہ ناراض ہونے کے بعد بھی مرنے والے کا آخری دیدار کرنے ضرور آتے ہیں اور یہ بات یاد رکھی جاتی ہے کہ ہمارے فلاں عزیز کے مرنے پر یہ فلاں شخص نہیں آیا۔ اسی لیے گاؤں میں میت کو کفنانے کے بعد ایک آخری دفعہ سب کے سامنے لاتے ہیں اور اس کے بعد باقی مذہبی رسومات کا فریضہ سر انجام دیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ ہر علاقے

میں کسی فرد کے مرنے کے بعد مختلف رسومات ادا کی جاتی ہیں مثلاً قل کی رسم، سوم کا درود، ساتویں کا درود، جمعرات اور اس طرح کی رسومات ہوتی ہیں ان میں قرآن خوانی اور مختلف قسم کے کھانے بنائے جاتے ہیں اور عزیز و اقارب کو بلایا جاتا ہے اسی طرح ایک رسم چہلم ہے جس کا ذکر "جندر" میں ہے۔ "چالیسویں تک میں چچا کے گھر ہی رہا۔ لیکن اس دوران میں، میں کسی رات بھی گہری نیند نہیں سو سکا۔"(۳۴) چہلم کو چالیسویں بھی کہتے ہیں اس میں زیادہ تر عورتیں شرکت کرتی ہیں اور اس میں محض شرکت کی رسم ہی ادا کرتی اور پھر فاتحہ خوانی اور طعام کے بعد واپس چلی جاتی ہیں۔ کھانا زیادہ تر فاتحہ خوانی کے بعد مولوی اور طالب علموں میں تقسیم کر دیا جاتا ہے۔ مختلف علاقوں میں چہلم کے بعد برسی کی رسم ادا اور اسی طرح کی رسموں کا سلسلہ چل نکلتا ہے۔ شاہد احمد رزاقی نے اپنی کتاب میں رسمِ چہلم کے حوالے سے لکھا ہے کہ:

> "سوا مہینے کے بعد چہلم یا چالیسویں کا فاتحہ ہوتا ہے۔ اس میں شرکت کے لیے عورتیں جمع ہوتی ہیں اور فاتحہ کر کے میوہ اور مٹھائی تقسیم کرتے ہیں۔ چہلم کے موقع پر مستحق لوگوں کو کپڑے تقسیم کرنے کا بھی رواج ہے۔"(۳۵)

اسی طرح مختلف علاقوں میں چہلم کے دن بہت سی اور رسومات بھی ادا کرتے ہیں مثلاً کپڑے دینے کا رواج اور اگر مردہ مرد ہو تو اکیس جوڑے اور اگر عورت ہو تو یہ کم جوڑے غریبوں اور مسکینوں میں تقسیم کرنے کا رواج ہے۔ گاؤں میں اسی طرح کی متعدد ایسی رسومات ہیں جو انہوں نے بغیر کسی حیل و حجت کے اپنے ثقافتی ورثے کا حصہ بنا رکھی ہیں۔ جن ڈولی کی رسم الگ گھر بسانے کا رواج اور اس طرح کی کئی ایسی رسومات ہیں جن کو لوگوں نے اپنا رکھا ہے۔

iv. علوم و فنون

بیشتر علاقوں کا زیادہ تر ثقافتی ورثہ وہاں کے انداز و اطوار اور طرز زندگی پر مشتمل ہوتا ہے۔ اس ورثے میں کھانے پینے، اوڑھنے پہننے سے لے کر لوگوں سے میل جول کے انداز علوم و فنون، رسوم و روایات، لباس،

رہن سہن، اخلاقی اقدار بھی شامل ہیں۔ گویا ہر شے ہی حقیقت میں ثقافت کا حصہ ہوتی ہے لیکن ان میں کچھ ایسی چیزیں ہوتی ہیں جو ثقافت کی بہترین نمائندگی کرتی ہیں اور حقیقت میں فنون ہی وہ چیزیں ہیں جو لوگوں کی شخصیت کی روح جذبات و احساسات کی نمائندگی کرتی ہیں جس طرح انسانی اعضاء میں آنکھ داخلی جذبات کا موثر انداز میں اظہار کرتی ہے اسی طرح فنون اور دستکاریاں بھی کسی قوم کے چہرے کو دیکھاتی ہیں اور ان کے بغیر قوم چہرہ پر تاثر دیکھائی دیتا ہے۔ جب بھی ہم کسی ملک کی سڑکیں، مقربے، عمارات، مندر، تاریخی مقامات دیکھتے ہیں تو اس سے نہ صرف ان کی تہذیب کا پتا چلتا ہے بلکہ ہمارے سامنے وہ لوگ بھی آجاتے ہیں جو کئی عرصہ پہلے اس جہان فانی سے کوچ کر گئے۔ علوم اور فنون نہ صرف ان کو ہماری نظر میں دوبارہ زندہ کرتی ہیں بلکہ ہم اس ثقافت و تہذیب کی حدود کا بھی تعین کر لیتے ہیں کہ ثقافت کے اس پہلو کا ماخذ کیا ہے اصل میں فنون کی ہی بدولت وہ سارا ورثہ محفوظ رہتا ہے اور نسل در نسل آگے بڑھتا ہے۔ کسی خاص علاقے کی فنون ہی اس علاقے کی تہذیب سے بہتر طریقے سے آگاہ کرتے ہیں۔ علوم و فنون کے حوالے سے ڈاکٹر محمد صغیر نے اپنی کتاب "پونچھ کی تہذیب و ثقافت" میں لکھا ہے "وہ فن مثلاً ادب، موسیقی، مصوری، عمارت گری اور دستکاریوں جن میں باطنی تجربے، قدریں، عقائد و افکار اور ظاہری طور و اطوار بہت ہی مرصع اور ترشی ہوئی صورت میں اظہار پاتے ہیں۔"[۳۶] تقریباً ہر دیہی معاشرے کی یہ خاصیت ہے کہ وہ ایک مخصوص حد تک کفیل طرزِ زیست کا حامی ہوتا ہے یعنی ضروریات زندگی کی زیادہ تر اشیاء مقامی طور پر مل جاتی ہیں اور بیرونی طور پر تیار ہونے والی اشیاء کو غیر معیاری سمجھا جاتا ہے اور ان کے خرید و استعمال سے گریز کرنا ہی مناسب سمجھا جاتا ہے۔ ہری پور ہزارہ کی بھی ثقافت کا یہی طرز ہے کہ وہاں کے مکینوں نے اپنی ضروریات زندگی کی اکثر چیزیں خود ہی تیار کی ہیں اور یوں ان روزمرہ استعمال ہونے والی اشیاء کی تیاری جہاں ان لوگوں کی ذہنی چابکدستی اور فنکارانہ مہارت کا منہ بولتا ثبوت ہے وہاں اسے گھریلو صنعت یا گھریلو دستکاری کا بھی نام دیا جا سکتا ہے۔ ان کی اہم مثالیں چکی جو روزمرہ کا آٹا لینے کے لیے گھر کی بنیادی ضرورت ہے۔ چرخہ لوک گتیوں کا حصہ ہونے کے ساتھ ساتھ پرانے وقتوں میں عورتیں بھیڑوں کی اول سے گرم پٹیاں تیار کرتی تھیں جو واسکٹ، اونی ٹوپی اور اسی طرح کی دوسری اشیاء بنانے کے کام آتی تھیں۔ اسی طرح اختر رضا سلیمی نے ناول "جندر" میں جس خو

بصورتی سے فنون کو بیان کیا ہے وہ نہ صرف اس علاقے کی ثقافت بلکہ وہاں کے ماحول اور طرزِ زندگی سے بھی آگاہ کیا ہے جہاں پر ایسی گھریلو صنعتیں عام ہیں اسی طرح کی ایک گھریلو صنعت جندر کا ذکر اختر رضا سلیمی نے ناول میں کیا۔ ناول کا عنوان "جندر" ہی ہے جو اس دور کا خاص ثقافتی ورثہ ہے۔ "جندر" کی تعریف ڈاکٹر محمد صغیر نے یوں کی ہے:

> "چکی ایک ایسی چیز ہے کہ جب بھی آپ کسی پرانے گھر میں "بیسوے" کی طرف سے داخل ہوں۔ آپ کی نگاہ اس پر ضرور پڑتی ہے کہ پہلے وقتوں میں ہر گھ کا لازمی جزو بھی۔۔۔۔ لیکن بعض اوقات گھر میں زیادہ آٹے کی ضرورت عورتیں محض Reliefدینے کے لیے "پن چکی" سے بھی مکئی گندم وغیرہ پیسوائی جاتی ہے۔ "پن چکی "کو مقامی زبان میں "جندر "یا "گھڑات "کہتے ہیں ۔ یہ بر ساتی نالوں با لخصوص "رنگڑوں "کے کنارے لگا ئے جاتے ہیں ۔ گھڑا ت چلانے والے کو "گھڑائی "یا "جندروئی "کہا جاتا ہے۔ اس پیشے سے کئی لوگوں کا رزق وابستہ ہے اور کئی لوگ اس پیشے سے وابستہ ہیں۔"(۳۷)

جندر چلانے والے کو جندروئی کہتے ہیں اور ناول "جندر" سے ہی جندر کی اہمیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے گویا جندر جیسی صنعت کے بغیر اس علاقے کا تصور ہی ممکن نہیں تھا۔ اس گاؤں میں وہ جندر تھا جو اس ناول کے ہیرو ولی محمد کے آباؤاجداد نے لگایا تھا۔ جندر کا ذکر اختر رضا سلیمی نے ناول میں یوں کیا:

> "پانی اترنے کے بعد جندر کو از سر نو تعمیر کیا گیا اور اس کے لیے دو تارو کے مقام پر نئے پاٹ تر شوائے گئے۔ کمرے کی تعمیر اور دیگر ضروری کل پرزوں کی تنصیب کے بعد جب ان پاٹوں کو اٹھا کر لانے کا مر حلہ آیا تو ایک صبح دو در جن کے قریب لوگوں کو پاٹوں کی جوڑی لانے دو تار روانہ کیا گیا۔"(۳۸)

جندر کے تمام اوزاروں کو جزئیات کے ساتھ بیان کیا جس لو کیل میں یہ ناول لکھا گیا وہاں جندر کا ہونا ہر ایک کے لیے بہت ضروری تھا۔ ثقافتی ورثہ ہونے کے ساتھ ساتھ ہر گھر کی بنیادی ضرورتوں کو پورا کرنے کا

واحد حربہ تھااور وہاں کے لوگ جندر کے بغیر زندگی کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ وہاں پر آٹا پسوانے کی واحد مشین "جندر" تھی اور تمام لوگ وہیں سے آٹا پسواتے تھے۔

مقامی علاقوں میں ضروریات زندگی کے مد نظر لوگ ہاتھوں سے اشیاء بناتے ہیں اور ہاتھ سے بنے ہوئے لباسوں کو بھی پسند کیا جاتا ہے۔ عورتیں اون یا کریشیہ کی مدد سے ٹوپی، سویٹر اور دھجی اوراسی طرح کی سردیوں میں استعمال ہونے والی اشیاء بناتی ہیں اونی اشیاء میں چونکہ سردی لگنے کا خدشہ کم ہوتا ہے۔ پہاڑی علاقے میں چونکہ سردی میدانی علاقے کی نسبتاً زیادہ ہوتی ہے وہاں درجہ حرارت اکثر و بیشتر نقطہ انجماد سے گر جاتا ہے اس شدید سردی میں ہاتھوں سے بنی ہوئی اونی ٹوپیاں اور سویٹر کام آتے ہیں جس کا ذکر ناول میں ہے "ہاتھوں سے بُنی سویٹر کا ایک دھاگا کھینچ کر آسانی سے ادھیڑ لیا جاتا ہے۔"(۳۹) گاؤں میں ہاتھ سے بُنی ہوئی اشیاء ان کی ثقافت میں عام ہے۔ وہاں کے لوگ ایسی اشیاء پہنتے ہیں اور اس طرح کی کشیدہ کاری کو پسند کرتے ہیں۔ ہاتھ سے بنائے جانے والی اشیا پسند کی جاتی ہیں کیونکہ وہاں سردی زیادہ ہوتی ہے اس لیے اونی ٹوپیاں سویٹر وغیرہ زیادہ استعمال ہوتے ہیں۔ اون چونکہ دوسرے کپڑے کی نسبت زیادہ گرم ہوتی ہے اور سردی کو روکتی ہے۔

گاؤں میں مٹی سے بنائے جانے والے برتن استعمال ہوتے ہیں۔ مٹی کے پلیٹ نما برتن کو رکابی کہتے ہیں۔ یہ برتن دیدہ زیب ہونے کے ساتھ ساتھ ان کی فنی مہارت اور ذہنی چابکدستی کا عمدہ شاہکار ہوتے ہیں۔ ان مٹی کے برتنوں کا استعمال جہاں وہ دودھ، سالن اور پانی لسی وغیرہ کی تازگی اور ٹھنڈک اوراصل ذائقہ کو برقرار رکھتاوہاں وہ حفظان صحت کے تمام معیاری اصولوں پر پورااترتا ہے۔ مٹی کے کوزے کی تعریف صغیر خان نے اپنی کتاب میں یوں کی ہے "کوجہ" یہ مٹی کا لوٹاہوتا ہے جو خاص کر وضو کے لیے استعمال ہوتا ہے۔"(۴۰)

کوزے کو کوجہ بھی کہتے ہیں کوزے کا ذکر اختر رضا سلیمی نے اپنے ناول "جندر" میں اس طرح بیان کیا ہے "انھیں دیسی گھی میں اچھی طرح سے تلا اور اپنا اپنا مرغا چٹ کر کے گھی کو مٹی کے کوزے میں ڈال کر باری باری گھونٹ بھرنے لگے۔"(۴۱) جس علاقے کی ثقافت کو اختر رضا سلیمی گاؤں کے اکثر مواضعات میں مٹی کے

برتن استعمال کیے جاتے ہیں جن کا ذکر اس علاقے کی ثقافت بیان کرتے ہوئے ناول" جندر" میں کیا ہے۔لوگ مٹی کے کوزے کو وضو کے ساتھ ساتھ کھانے پینے کے لیے بطور برتن استعمال کرتے تھے۔چونکہ برتن بنیادی ضرورت تھی اور لوگ اپنی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے خود ہی برتن بناتے تھے اور انھیں کاہو کی لکڑی سے بھٹی میں پکاتے تھے۔

لکڑی سے بنایا جانے والا سامان بھی علاقے کی ثقافت کا ہی عکاس ہوتا ہے لوگ اپنی بنیادی ضرورتوں کے لیے آرائش و زیبائش کے علاوہ لکڑی سے بنائے جانے والے آلات اپنی ضرورتوں کے تحت استعمال کرتے ہیں۔جن میں گھروں میں استعمال ہونے والے برتنوں سے لے کر پہاڑوں کا دامن چیرنے کے لیے کدال اور معاشی ضروریات پوری کرنے کے لیے مختلف آلات جیسے کلہاڑی، آری وغیرہ کے دستے شامل ہیں۔ ان تمام اشیاء کے لیے لکڑی بنیادی ضرورت ہے جس کا ذکر اختر رضا سلیمی نے اپنے ناول"جندر" میں کیا"شملات سے پوچھے بغیر کلھاڑی کے لیے کاہو کا ایک دستہ کاٹنے کی ہمت نہیں ہوئی تھی۔"[۴۲]وہاں چونکہ کاہو کے درخت بہت زیادہ ہوتے تھے لوگ اسی کو استعمال میں لاتے تھے اور اس کے دستے کو مضبوط دستہ خیال کرتے تھے اور آلات وغیرہ کے دستوں کے لیے کاہو کو ہی بہترین خیال کرتے تھے۔تمام علوم وفنون بھی اپنے خطے کی ثقافت کو بیان کرتی ہیں ان میں ہاتھ سے بنی ہوئی تمام اشیاء مثلاً کپڑوں سے لے کر تصویروں تک الغرض تمام اشیاء کا تعلق علوم وفنون سے ہی ہے یہ اپنے علاقے کی ثقافت کے ساتھ ساتھ تاریخ کو بھی بیان کرتی ہے ان کی مدد سے انسان اپنی معدوم ہوتی ثقافت کو بھی جان سکتا ہے جو اظہار کا بہترین ذریعہ ہے۔

ج: اعتقادی مآخذ کے ثقافتی عناصر

i مذہبی رسومات

کسی بھی علاقے کی ثقافت میں بنیادی مآخذ مذہب ہوتا ہے۔ ثقافت دراصل کئی مذہبی اقدار یا جغرافیائی روایات ورسوم کا مجموعہ ہوتا ہے۔زیادہ تر ثقافتی اقدار مذہب سے ہی لی جاتی ہے۔اسلامی معاشرے

میں اسلامی ثقافت بنیادی کردا کی حامل ہوتی ہے۔ ثقافت تمام رسومات مستعار لیتی ہے اور ایک با قاعدہ ثقافت وجود میں آتی ہے۔ مذہب ہر معاشرے کا بنیادی جزو ہے۔ مذہب کے بغیر کسی معاشرے کا وجود ممکن نہیں۔ مذہب اور ثقافت کا رشتہ جوڑنے کی کوشش کی بجائے تو اس صورت میں غور و فکر کرنے والوں نے مذہب کو ثقافت کا جزو ہی قرار دیا ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کے ہاں بھی کچھ اس طرح کی سوچ ابھرتی نظر آتی ہے۔ انہوں نے اپنے مطبوعہ انٹرویو میں یہ کہا:

> "اب رہا آپ کا سوال کہ مغربی دانش وروں نے لفظ کلچر کی تعریف کرتے ہوئے یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ مذہب کلچر کا جزو ہے کل نہیں تو یہ ایسی غلط بات بھی نہیں ۔۔۔۔ عملاً مذہب اس کا جزو ہے۔ کل نہیں۔"(۴۳)

معاشرے میں امن اور بگاڑ سے بچاؤ کے لیے اور خیر اور سعادت و کامرانی کے لیے مذہب ہی سب سے اہم بنیاد ہے۔ مذہب کو کلچر کا جزو نہیں بلکہ کل قرار دیا ہے کیونکہ مذہب کے بغیر معاشرے کی اقدار و روایات ممکن نہیں اور عملی لحاظ سے اس کا کل ہے اس کے علاوہ ٹی ایس ایلیٹ نے بھی جزو اور کل کی بحث کو چھوڑ کر اسی طرح کی نوعیت کو من و عن قبول کیا ہے وہ لکھتے ہیں "کسی قوم کی ثقافت بنیادی طور پر اس کے مذہب کی تجسیم ہوتی ہے۔"(۴۴) درحقیقت میں ثقافت اور مذہب کے درمیان جزو اور کل کا رشتہ نہیں بلکہ مذہب ہی دراصل ثقافت کی روح ہے اور اس کے لیے بنیاد کا درجہ رکھتی ہے۔ ثقافت کسی بھی قوم کے لیے ریڑھ کی ہڈی کی اہمیت رکھتی ہے اور یوں ہی ثقافت کا بنیادی مآخذ در اصل مذہب ہے۔ مذہب کی اہمیت کو واضح کرتے ہوئے ڈاکٹر سید عبداللہ نے جمیل جالبی اور ٹی ایس ایلیٹ سے اختلاف کرتے ہوئے مذہب کو ہی ثقافت کا سرچشمہ قرار دیا ہے وہ اپنی کتاب "کلچر کا مسئلہ" میں لکھتے ہیں۔

> "مذہب اور ثقافت کے تعلق کی مخصوص نوعیت کو ہم ایک مثال سے واضح کر سکتے ہیں جس طرح سردی، گرمی، مرطوب آب و ہوا اور طبعی حالات ثقافت کو ایک رنگ روپ دیتے، ہمارے رہن سہن لباس اور تعلقات کو ایک شکل عطا کرتے ہیں لیکن اس کے

باوجود سردی یا گرمی ثقافت کا جزو یا حصہ نہیں بالکل اسی طرح مذہب کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ ثقافت کا جزو یا حصہ نہیں بلکہ اس کے قلب میں اصول عمل کا درجہ رکھتا ہے۔"(۴۵)

ناول نگار کے لیے اس حقیقت کا تسلیم کرنا بے حد اہم ہے کہ ثقافت کی روح مذہب ہے اس بحث میں الجھنے سے گریز کرنی چاہیے کہ مذہب ثقافت کا بنیادی جزو ہے یا ثانوی۔ جزو بنیادی ہو یا ثانوی اس کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاتا۔ اختر رضا سلیمی اس حقیقت سے بخوبی واقف نظر آتے ہیں جس معاشرے کی ثقافت کو انہوں نے بیان کیا وہاں ہمیں مذہب اسلام کی ثقافت نظر آتی ہے یوں تو دنیا میں متعدد مذاہب موجود ہیں اور ہر مذہب کے پیروکار جگہ جگہ نظر آتے ہیں۔ اس ناول میں مذہب اسلام کی رسومات دیکھنے کو ملتی ہیں۔ جندر میں موجود مرکزی کردار ولی محمد (جندروئی) جسے ہر وقت اپنی موت کا خیال تنگ کرتا ہے اور اپنے مرنے کے بعد ہونے والی جن رسومات کا تذکرہ کرتا ہے وہ کچھ یوں ہے:

"بہر حال جیسے ہی اسے یہ اطلاع ملے گی وہ یک دم سکتے میں آجائے گا، اس لیے نہیں کہ اُسے اس کے باپ کی موت واقع ہو چکی ہے بلکہ اس لیے کہ مجھے کفنانے دفنانے کے لیے اسے ہر حال یہاں آنا پڑے گا اور وہ بھی اپنے بیوی بچوں سمیت۔"(۴۶)

اسلامی معاشرے میں جب کوئی انسان مر جاتا ہے تو اس کی لاش کو نہ تو پھینکا جاتا ہے اور نہ ہی جلایا جاتا ہے ہر وہ انسان جو مذہبِ اسلام کا پیروکار ہوتا ہے وہ ہمیشہ یہ دعا کرتا ہے کہ اسے مرنے کے بعد کفن دفن نصیب ہو اور یہ ایسی رسومات ہوتی ہیں ان کو کوئی بھی فرقہ ہر حال میں مانتا ہے کفنانے دفنانے کے لیے کچھ باتیں مختلف ہو سکتی ہیں لیکن مجموعی طور پر ایک ہی بات ہوتی ہے پہلے مردے کو غسل دیا جاتا ہے اس کے بعد اس کو کفن پہنچایا جاتا ہے معاشرتی رسومات میں ایک اہم رسم یہ بھی ہے کہ جب کوئی فوت ہو جائے تو اس کے قریبی رشتہ دار لازمی شرکت کرتے ہیں اور اس کے کفن دفن کا انتظام ان کے سر ہوتا ہے اگر وہ ان رسومات

کا خیال نہ کریں تو ان کے دوسرے خاندان والے ان کے بارے میں بد گمانی کرتے ہیں۔ یہاں بھی ناول نگار نے۔

"کچھ لوگ قبر کھد وانے کا انتظام کرتے ہیں اور کچھ لوگ نہلانے اور کفنانے کا۔ مردے کو غسل دینے کے لیے پانی گرم کیا جاتا ہے جس میں بیری کے پتے اور ختمی کے پھول ڈال دیے جاتے ہیں۔ ایک گڑھا کھود کر اس پر تخت بچھا دیتے ہیں اور مردے کو تخت پر لٹا کر نہلاتے ہیں۔ غسل کا پانی اس گڑھے میں جمع ہوتا ہے۔ جو لوگ مردے کو نہلانا نہیں جانتے وہ اس سے واقف لوگوں کو بلا لیتے ہیں۔"(۴۷)

مسلمانوں کے ہاں مردے کو باقاعدہ غسل دیا جاتا ہے۔ مردہ عورت کو غسل دینے والی کو غسالہ اور مردہ مرد کو غسل دینے والے کو غسال کہتے ہیں۔ غسل کے کچھ مخصوص طریقے ہوتے ہیں جو مذہبی پیروکار یعنی مولوی اور دین کے علم رکھنے والے کو معلوم ہوتا ہے۔ میت کو غسل وہی دیتا ہے جو ان طریقوں سے آشنا ہو۔ فرہنگ آصفہ میں مولوی احمد دہلوی نے مذہبی رسم کی تعریف یوں کی ہے "مردے / میت کو غسل دینا مردے کو نہلانا، سنسنان دینا: مردے کے میت جنازہ کو غسل دیا جاتا ہے۔ ہر مذہب میں غسل کے اپنے طریقے ہیں۔"(۴۸) "جندر" ناول جس لوکیل میں لکھا گیا ہے وہ ایک اسلامی معاشرہ ہے۔ اختر رضا سلیمی نے اس ثقافت کو کرداروں کے مکالمے کے ذریعے زندہ کیا ہے اور اس کی اہمیت بیان کی ہے:

"میں نے لوگوں کے بیچ میں گھس کر دیکھا تو سامنے میرا چچازاد بھائی عارف، جو مجھ سے ایک سال بڑا تھا، لکڑی کے ایک تختے پر سویا پڑا ہے اور لوگ، جن میں سے زیادہ تر میرے رشتہ دار تھے اسے نہلا رہے ہیں۔ مجھے حیرت ہوئی کہ سر پر پانی ڈالنے کے باوجود وہ نہ تو آنکھیں کھول رہا ہے اور نہ ہی ہاتھ پاؤں ہلا جلا رہا ہے۔ حالاں کہ جب میرا باپ مجھے نہلاتا تھا تو میرا سانس رُک جاتا تھا اور میں رونا شروع کر دیتا تھا۔"(۴۹)

جندروئی نے پہلی مرتبہ کسی میت کو غسل ہوتے ہوئے دیکھا تھا اسے یہ بات درجہ حیرت میں ڈال رہی تھی کہ آخر ایک خاموش فرد کو یوں کیوں نہلایا جا رہا ہے جو بدلے میں اپنی مذمت بھی نہیں کر رہا۔ اور وہ بے بس بے حس و حرکت حرکت پڑا ہوا ہے یہ اس کے لیے ایک بالکل نئی بات تھی۔ اسلامی معاشرے کی یہ

ایک عام رسم ہے جس میں مردے کو ایک مخصوص طریقے سے غسل دیا جاتا ہے۔ مرنے کے بعد ہونے والی رسومات میں سب سے پہلی رسم غسل ہے اور اس کے بعد مردے کو کفن پہنایا جاتا ہے۔

"مردے کو نہلانے کے بعد کفن پہنایا جاتا ہے جو تین کپڑوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ لفافہ، ازار اور کفنی۔ نہلانے کے بعد مردے کے بدن کو کپڑے سے پونچھتے ۔۔۔۔مردے کو کفن پہنا کر اس میں لٹانے کے بعد اوپر ایک بڑی چادر ڈال دیتے ہیں۔"(۵۰)

ہزارہ میں بھی مرنے کے بعد ہونے والی رسومات میں کفن بھی خاصی اہمیت کا حامل ہے۔ کفن سفید رنگ کی چادر ہوتی ہے عورتوں کے کفن کے پانچ حصے اور مرد کے کفن کے تین حصے ہوتے ہیں۔ مرنے کے بعد مردے کو سفید رنگ کی چادر جسے کفن کہتے ہیں میں باقاعدہ طور پر باندھ کر اسے تیار کیا جاتا ہے۔ اور جب کفن پہنا دیا جاتا ہے اس کے بعد عزیز و اقارب اس کی میت کو کندھا دیتے ہیں اور اسے کندھوں پر اٹھا کر اس جگہ لے جاتے ہیں جہاں اس کی قبر تیار ہوتی ہے۔ اسلامی معاشرے میں ہر علاقے یا شہر میں کچھ جگہ مخصوص ہوتی ہے جسے قبرستان کہتے ہیں۔ کفنانے کے بعد مردے کو قبرستان لے جاتے ہیں۔ اور مولوی صاحب جو اسلامی معاشرے کا بنیادی کردار ہوتا ہے وہ اس مردے کی نماز جنازہ پڑھتا ہے اور یہ ایک فرض کفایہ ہوتا ہے جو ہر حال میں ادا کیا جاتا ہے۔ نماز جنازہ میں گاؤں کے تماک لوگ اپنی تمام مصروفیات سے وقت نکال کر ضرور شرکت کرتے ہیں یہ اسلامی رسم ہونے کے ساتھ ساتھ معاشرتی رسم بھی ہے جس میں شرکت نہ کرنے والے سے سخت ناراضگی کا اظہار کیا جاتا ہے۔ جنازہ کے بعد ہونے والی اہم رسم قبر میں اتارنا ہے۔ اس کے بعد میت کو قبر میں اتارا جاتا ہے اور اپنے عزیز جو قریبی رشتہ دار ہوتے ہیں وہ مٹی ڈالتے ہیں۔ سیمنٹ کی پیڑیاں رکھنے کے بعد اہم فریضہ مٹی ڈالنا ہوتا ہے۔ اسی طرح کی تمام اسلامی رسومات کا اظہار اختر رضا سلیمی نے جندر میں یوں کیا ہے:

"سہ پہر کے وقت جب لوگ اسے سفید کپڑے میں لپیٹ کر قبرستان کی طرف جانے لگے، جو چچا کے گھر کے بالکل قریب تھا، تو میں بھی ان کے ساتھ چل پڑا۔ قبرستان پہنچ کر انھوں نے اسے ایک چھوٹی سی چٹائی پر رکھا اور سب لوگ صفیں باندھ کر نماز پڑھنے لگے جب کہ میں دوسرے لڑکوں کے ساتھ اس گڑھے کو حیرت سے دیکھنے لگا جس کے اندر دیواریں اساری جا چکی تھیں۔ یہ میری حیرت میں خوف کا عنصر اس وقت شامل ہوا جب لوگ اسے گڑھے میں اتار کر اس کی دیواروں پر تختے رکھنے لگے۔ جب مٹی ڈالنے کی باری آئی تو میں خوف زدہ ہو کر اپنے باپ سے، جو اس وقت مٹی ڈالنے والے لوگوں میں شامل تھا، لپٹ گیا اور اس نے بیلچہ کسی دوسرے کے ہاتھ میں تھما کر مجھے اٹھا لیا تھا۔"(۵۱)

کسی بھی معاشرے کی ثقافتی روح چونکہ مذہب ہی ہوتا ہے لہٰذا مذہبی رسومات کے ساتھ ساتھ دوسری رسومات بھی جڑ جاتی ہیں جغرافیائی ثقافت کا حصہ ہوتے ہیں۔ عزیز و اقارب میں کوئی جتنا بھی ناراض ہو خوشیاں بھلے الگ سہی لیکن گاؤں کے ماحول میں غم زیادہ تر ساجے ہی ہوتے ہیں۔ غموں میں جن میں سب سے بڑا غم کسی اپنے کی موت کا ہی ہوتا ہے۔ ہزارہ میں بھی مرنے والے کے عزیز و اقارب تمام رسومات کو ادا کرتے ہیں اور ان کا خاص خیال رکھا جاتا ہے جس طرح اس ناول میں جندروئی کا والد اپنے قریبی عزیز کی تدفین کے لیے بڑھ چڑھ کر حصہ لیتا ہے ہزارہ میں یہ رواج عام ہے کہ مردے کو لحد میں اتارنے کے بعد اس کے عزیز باری باری مٹی ڈالتے ہیں یوں وہ مردے سے اپنی محبت و عقیدت کا اظہار کرتے ہیں۔ مرنے کے بعد مردے کے عزیزوں کی ایک اہم ذمہ داری اس کے مرنے کی اطلاع ہوتی ہے اور کسی کے مرنے کی اطلاع سب گاؤں والوں کو دی جاتی ہے جن میں سرِ فہرست اس کے گھریلو عزیز و اقارب یا خاندان والے ہوتے ہیں۔ تمام عزیز و اقارب مل کر اس کے کفن و دفن کا انتظام کرتے ہیں جو ایک مذہبی رسم ہزارہ میں بھی برتی جاتی اس کا ذکر اختر رضا سلیمی نے ناول "جندر" میں کیا۔

"پانچ سال پہلے جب اس کی موت واقع ہوئی تو راحیل نے اس کی تدفین وہیں کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس کی وصیت کے مطابق مجھے بھی اطلاع دی گئی۔ میں جنازے میں شریک ضرور ہوا لیکن تدفین کے بعد اسی شام واپس آگیا۔"(۵۲)

مرنے کی اطلاع ضرور سب کو دی جاتی ہے اسی طرح ناول میں جندروئی ولی محمد کی اس کی بیوی سے علیحدگی کو پچیس سال گزر گئے لیکن وہ اس کے جنازے میں شریک ہوا اور تدفین کے عمل تک وہی رکا رہا یہ الگ بات ہے کہ جنازے کے فوراً بعد وہاں سے روانہ ہو گیا۔ یہاں تدفین اور جنازے کے علاوہ معاشرتی اقدار کو اس انداز سے برتا گیا ہے کہ ہزارہ کی ثقافت جھلکتی نظر آتی ہے۔

نماز اسلام کا بنیادی رکن ہے۔ یہ مذہبی رسم کے علاوہ دین کی روح کا درجہ رکھتا ہے۔ تمام نمازوں کے اوقات مقرر ہیں۔ مسلمان ہونے کے ناطے پانچ نمازیں روزانہ فرض ہیں جن میں فجر، ظہر، عصر، مغرب، عشاء شامل ہیں۔ ہر نماز کے لیے وقت مقرر ہے یہ اسلامی معاشرے کی بنیادی رسم ہے۔ نمازوں کو ارکان اسلام میں اس لیے بنیادی اور اولین حیثیت حاصل ہے کہ یہ خالق کی نعمتوں اور رحمتوں کا شکر اور بطور مسلمان بندہِ خدا عبادت کے قیام کی آسان ترین پریکٹس یعنی عملی اظہار ہے۔ نماز کی مختلف اوقات کا تذکرہ جندر میں متعدد جگہ نظر آتا ہے جن میں فجر، ظہر، عصر، مغرب اور عشاء کا ذکر بہت سی جگہوں پر کیا گیا ہے۔

"انھی دنوں میں سے ایک دن سویرے سویرے ایک آدمی اپنا اناج لے کر آگیا چار بڑی چونگیں تھیں۔ جنھیں، وہ دو گدھوں پر لاد کر لایا تھا۔ میں دن بھر اس کے دانے پیستا رہا، جب اسکی آخری چونگ ختم ہوئی تو مغرب کی اذانیں ہو چکی تھیں۔ اس کے جانے کے بعد میں نے ایک ہی چونگ پیسی۔ اتنے میں عشاء کی نماز کا وقت ہو گیا۔ ان دنوں میں پابندی سے نماز ادا کیا کرتا تھا۔ میں نے ایک بڑی چونگ کھارے میں انڈیلی اور نماز پڑھنے لگا۔"(۵۳)

نماز کو اذان کے بعد اس لیے ادا کرتے ہیں کہ بحیثیت مسلمان یہ اسلامی معاشرے کے لوگوں کا عقیدہ ہے کہ اذان مومن کو بیدار کرتی اور نماز کی ادائیگی کے لیے طہارت بنیادی جزو ہے۔ طہارت میں وضو کرنا ضروری ہوتا ہے۔ اور وضو کے بعد نماز ادا کی جاتی ہے۔ یہ اسلامی معاشرے کا ہر فرد جانتا ہے اور ان تمام اقداروں کو بخوبی واقف ہوتا ہے۔ اختر رضا سلیمی نے جس لوکیل میں یہ ناول لکھا ہے وہ چونکہ ایک اسلامی معاشرہ ہے اور وہاں یہ مساجد اور مدارس موجود ہیں۔

مساجد اسلامی معاشرہ کا اہم حصہ ہیں۔ تمام لوگ اپنے بچوں کو ابتدائی تعلیم و تربیت اور اکثر معاشرتی رسومات کا آغاز بھی مسجد میں اعلان کروا کے ہی کرتے ہیں مثلاً کوئی ایسی اطلاع جو ہر خاص و عام کے لیے یعنی تمام گاؤں والوں کی شرکت اس میں لازمی ہو تو ان تمام لوگوں کو اطلاع مسجد میں اعلان کر کے ہی دی جاتی ہے۔ مسجد ایک اسلامی درس گاہ ہونے کے ساتھ ساتھ تمام گاؤں کے لوگوں کو جوڑنے کا بھی ذریعہ ثابت ہوتی ہے۔ مسجد کی اہمیت کی پیش نظر ناول نگار نے بھی اسے اپنے ناول میں جگہ دی اور اس مذہبی ثقافتی اہمیت کی حامل جگہ کا تذکرہ کیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ مسجد کے لیے ایک فرد یعنی مولوی مقرر کر دیا جاتا ہے جو دینی مسائل اور قرآن کو اچھی طرح پڑھنا جانتا ہے۔ اور مساجد کی تمام ذمہ داریاں اسی کے ذمے ہوتی ہیں اور ان کو بخوبی ادا کرتا ہے۔ مساجد میں صفائی سے لے کر بلوں کی ادائیگی اور مرمتی کے علاوہ تمام امور کو دیکھتا ہے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ دیگر تمام مذہبی رسومات مثلاً نماز پڑھنے کا طریقہ، جنازہ پڑھانا اور اس طرح کی تمام مذہبی باتوں کسی بھی نیک کام کی سرانجامی اور آغاز سے قبل دعا اور ان کا طریقہ اور ادائیگی سے واقف ہوتا ہے۔ ناول نگار نے بھی اس ناول میں مسجد اور مولوی صاحب کا ذکر کیا ہے۔

> ”کٹائی کے آغاز سے ایک دن پہلے تمام لوگ مسجد میں جمع ہوتے اور جو موجود نہ ہوتے انھیں وہاں موجود افراد کے ذریعے کٹائی کے آغاز والے دن اور مقام کے بارے میں مطلع کر دیا جاتا۔ مقررہ دن نماز فجر کے بعد تمام لوگ مقررہ مقام پر دو صفیں بنا کر کھڑے ہو جاتے۔ اگلی درانتی بردار لوگوں کی ہوتی جب کہ اس سے پچھلی صف جو نسبتاً چھوٹی ہوتی، درانتیوں سے تہی؛، مولوی صاحب برکت کے لیے دعا کرتے۔“(۵۴)

درج بالا اقتباس میں کٹائی کے موسم میں تمام لوگوں کو مسجد میں ہی اکٹھا ہونا اور تمام معاملات کا طے پایا جانا کہ اس کام کے آغاز سے لے کر اختتام تک کون سی حکمت عملی مد نظر رکھنی ہے اور مولوی صاحب کا کام میں برکت اور جلد از جلد ختم ہونے اور بخیر و عافیت کام کی انجام دہی کے لیے دعا ان سے کچھ باتیں مذہب اور کچھ باتیں وہاں کے معاشرے اور ماحول سے پتا چلتی ہیں۔ مذہب اور معاشرے نے مل کر جو ثقافت بنا دی ہے یہ یوں ہی نسل در نسل منتقل ہوتی رہتی ہے۔ اسی مذہبی اور معاشرتی ثقافت کو اختر رضا سلیمی نے اپنے ناول میں بیان کیا ہے کہ ہزارہ کے خطے کے لوگ بھی یہ تمام مذہبی اور اخلاقی فریضہ سر انجام دیتے ہیں۔

معاشرے میں باعزت اور باوقار زندگی گزارنے کے لیے ثقافتی ورثے سے ہی مدد ملتی ہے جن میں کچھ اقدار طور طریقے مذہب سکھاتا ہے۔ مذہب اسلام ایک مکمل ضابطہ حیات ہے اور آداب معاشرت ہمیں مذہب ہی سکھاتا ہے۔ اسی طرح تمام دنیا متمدن اور مہذب قوموں میں ملاقات کے وقت محبت و عقیدت، پیار، جذبہ اکرام و خیر اندیشی کے اظہار کے لیے اور مخاطب کرنے کے لیے اور مانوس و مسرور کرنے کے لیے کچھ الفاظ کی ادائیگی کا رواج ہوتا ہے۔ ہندوستان میں چونکہ زیادہ تر ہندو ہیں تو ان کے ہاں "نمستے" کہا جاتا ہے۔ ترقی پذیر ممالک میں Good Night, Good After Noon, Good Morning, Good Evening اور اس طرح کے الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں چینی، جاپانی، جرمنی اس طرح ہر ممالک میں خواہ کسی مذہب سے متاثر ہیں یا نہیں کچھ نہ کچھ ایسے کلمات ضرور دوران ملاقات ادا کرتے ہیں۔ قبل از اسلام عربوں کے ہاں (**حَیاک اللہ**) اللہ تم کو زندہ رکھے یا (**انعم اللہ بک عیناً**) یعنی خداوند تعالیٰ تمہاری آنکھوں کو ٹھنڈا کرے اسی طرح کے جملے ادا کیے جاتے ہیں لیکن مذہبِ اسلام کے آنے کے بعد اس طرح کے تمام کلمات کی ممانعت کر دی گئی اور ان تمام کلمات کے بجائے مسلمانوں کو السلام علیکم ورحمتہ وبرکاتہ کہنے کی تلقین کی گئی۔ قرآن پاک میں اس مذہبی رسم کا ذکر اس انداز میں کیا گیا ہے۔ سورۃ النساء میں آدابِ معاشرت کو بیان کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا۔ "اور جب تم کو سلام دیوے کوئی تو تم بھی سلام (دعا) دو اس حساب سے بہتر وہی کہو الٹ کر بیشک اللہ جو ہر چیز کا حساب کرنے والا ہے۔"[۵۵]

مذہبی اقدار میں سلام کرنے کی فضیلت و اہمیت سے انکار نہیں کیا جاتا ہے۔ مذہب سے مستعار لی گئی یہ رسم معاشرے میں عام ہے اور خاص طور پر وہ معاشرہ جس کی زیادہ تر رسومات کی بنیاد حقیقت میں مذہبِ اسلام ہی ہے۔ جندر میں بھی اسی مذہبی رسم کا ذکر اختر رضا سلیمی نے کیا ہے۔ ”میں نے انھیں سلام کیا اور اندر آنے کو کہا۔ وہ خاموشی سے کمرے میں داخل ہوئے میں نے انھیں کاندھے پر سے بوری اتارنے میں مدد دی جو بہت بھاری تھی۔“(۵۶) ناول میں انھوں نے اسی مذہبی اقدار سے سیکھے گئے معاشرتی رویے کو بیان کیا ہے اور یہی اس گاؤں کی رسم ہے جو در حقیقت مذہبی رسم ہے۔ ان باتوں میں اس خطے کے لوگ بھی بہت خیال رکھتے ہیں اور مروت اور لحاظ کو برتتے ہوئے ادب کو ملحوظ خاطر رکھتے ہیں۔ جندر میں اس طرح کی اقدار کو ناول نگار نے واضح انداز میں بیان کیا چونکہ اس خطے کے لوگ مذہب اسلام سے تعلق رکھتے تھے اس لیے وہاں بھی سلام و دعا کا رواج عام نظر آتا ہے۔ ہزارہ کے لوگ بھی تعظیم رسمی کے تحت ہی سلام کر لیتے ہیں اور یہی اس علاقے کی خوبی بھی ہے کہ تمام لوگ ایک دوسرے سے معاشرتی لحاظ سے جڑے نظر آتے ہیں اور اس کے علاوہ سلام و دعا کا رشتہ ضرور رکھتے ہیں۔

ii. توہمات

مذہب اسلام سے قبل معاشرہ میں ایسی متعدد رسوم و روایات موجود تھیں اور لوگوں نے مختلف فرضی باتیں، من گھڑت اور بے اصل باتیں اپنے دل و دماغ میں بیٹھا رکھی تھیں جن پر وہ یقین رکھتے تھے اور اسی کو اپنا ایمان بھی تصور کرتے تھے۔ ان کے عقائد کے مطابق قبل از سفر اگر وہ پرندہ اڑتا دیکھ لیتے ان کے خیال میں اگر وہ دائیں طرف کا رخ کرتا تو سفر مبارک ہو گا اور اگر وہ بائیں طرف کا رخ کرے گا تو سفر منحوس ہو گا اور اس فرد کے لیے نامبارک ثابت ہو گا۔ اور یوں وہ سفر کا ارادہ ترک بھی کر دیتے تھے۔ الو کی آواز کو منحوس اور گھروں کے لیے اجاڑ اور تباہی کا سبب، ماہ صفر کو دکھوں اور پریشانیوں کا باعث اور اس ماہ کی آمد کو نحوست کی علامت سمجھا جاتا تھا۔ اس مہینے میں وہ شادی و بیاہ اور کوئی بھی مبارک کام کا آغاز کرنے سے گریز کرتے تھے۔ اپنے لیے تیرہ کا ہندسہ برا سمجھتے تھے اور ماہ صفر میں تیرہ تیجی کے دنوں میں کسی بھی چیز یا برتن کا

ٹوٹ جانا پورا سال نقصان کا باعث سمجھتے تھے۔ اور نا جانے اس طرح کے کئی اور فرسودہ عقائد اور بد شگونی کو اپنے عقائد کا حصہ سمجھتے تھے۔ وہ اس طرح کے عقائد واوہام کا شکار اس لیے بھی تھے کہ ان کے پاس کوئی مکمل ضابطہ حیات موجود نہیں تھا۔

دورِ جاہلیت میں کسی ایک انسان کی بیماری دوسرے کو لگ جانے کا خدشہ اس قدر ہوتا تھا کہ بیمار کو ایک اچھوت بنا کر رکھ دیا جاتا۔ تمام لوگ اس سے کنارہ کشی کرتے اور اسے ہمیشہ نامبارک و منحوس سمجھا جاتا تھا۔ لیکن مذہبِ اسلام کی آمد کے بعد نبیؐ نے اولین ترجیح توحید پر دی اور اس طرح کی تمام توہمات و عقائد جو ان لوگوں کے ایمان کا بنیادی جزو تھے منع فرمایا اور ایک معبود برحق کی عبادت کا درس دیا۔ انھوں نے بتایا کہ خیر و شر، نفع و نقصان سب اسی کے ہاتھ میں ہے وہی ذات کریم عبادت کے لائق ہے۔ اس کو عزت اور ذلت دونوں پر مکمل دسترس ہے وہ جسے چاہتا ہے عزت دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے ذلت دے دیتا ہے کسی قسم کی خرافات کا تعلق کسی انسان، پرندے یا مہینے سے منسوب کرنا درست نہیں ہے۔

دورِ حاضر میں ابھی کچھ ایسے علاقے یا دیہات ہیں جہاں پر ابھی بھی اس طرح کی توہمات موجود ہیں۔ ہندو معاشرے کے ساتھ کئی سال رہنے کی وجہ سے ہم نے ان کی رسومات کے ساتھ ساتھ اس طرح کی کئی توہمات کو اپنی ثقافت کا حصہ بنالیا ہے اور لوگ ان پر باقاعدہ ایمان رکھتے ہیں۔ ماہ صفر کے ابتدائی تیرہ دنوں جن کو تیرہ تیجی کے نام سے جانا جاتا ہے خصوصاً عورتیں انہیں بہت ہی منحوس سمجھتی ہیں ان دنوں میں شادی، منگنی، نئے کاروبار کا افتتاح اور کسی مبارک سفر کا آغاز نہیں کرتے ہیں۔ کئی گاؤں کی عورتیں ماہ صفر گزر جانے کے بعد چنے یا گندم پکا کر چھت پر پھینک دیتے ہیں ان کا خیال ہے کہ تمام مصائب و آلام اور بلائیں چلی جائیں گی حالانکہ ایسی تمام باتوں کا مذہب سے کوئی تعلق نہیں۔ اسی طرح کئی علاقوں میں لوگ ابھی بھی کچھ ایسے دن ہیں کہ جس دن ان کے ساتھ کوئی بہت ہی برا حادثہ یا کوئی جانی یا مالی نقصان ہوا اس دن کو خواہ مخواہ اپنے لیے منحوس سمجھنے لگتے ہیں اور اس دن کو اپنے لیے منحوس دن کہتے ہیں جس لوکیل میں جندر ناول لکھا گیا وہاں بھی اس طرح کی توہمات موجود ہیں جس کا ذکر ناول میں ناول نگار نے کیا ہے۔ ”مجھے ابھی بھی یاد ہے کہ اس منحوس دن

سے ایک رات پہلے جب میں نے سکول سے واپسی پر اسے جندر کی کھائی میں مردہ حالت میں پایا تھا۔"[۵۷] ولی محمد (جندروئی) کے والد کی وفات کا دن اس کی زندگی کا اذیت ناک دن تھا۔ لیکن مذہبی لحاظ سے دیکھا جائے تو زندگی، موت، تقدیر، بدقسمتی کا تعلق دنوں سے منسوب نہیں ہے۔ موت کا ایک دن مقرر ہے اور ہر نفس نے موت کا ذائقہ چکھنا ہے۔ لیکن ولی محمد نے چونکہ جس معاشرے یعنی ماحول میں پرورش پائی وہاں پہلے اسی طرح کی باتیں مشہور تھیں اور یہ بات اس کے لیے کوئی نئی نہیں تھی۔ اس لیے اس نے بلا جھجک اس دن کو منحوس کہا۔ چونکہ توہمات ہماری ثقافت کا حصہ ہیں ہمارے ارد گرد ایسی بہت سی توہمات موجود ہیں۔

توہمات میں اکثر اوقات لوگ کسی فرد سے یا کسی پرندے سے کوئی باتیں جوڑ دیتے ہیں جیسے الو کی آواز کو منحوس سمجھنا۔ ان کا خیال یہ ہوتا ہے کہ الو جب بھی آواز نکالتا ہے یا بولتا ہے تو وہ اپنی زبان میں تباہی مانگتا ہے اسی لیے جس گھر میں الو بولتا ہے وہ گھر جھگڑے فسادات اور تباہی و بربادی کا شکار ہو جاتا ہے اور اس گھر سے برکت ختم ہو جاتی ہے۔ یعنی اسی طرح جانوروں کی بولیوں، ان کی آمد و رفت کے فیصلوں سے اپنے ارادوں کو موقوف کر دینا۔ اسی طرح کے ایک جانور (بجو) کے بارے میں ہزارہ کے علاقے میں بھی کچھ باتیں مشہور ہیں اور لوگ اس بچاؤ کی تدابیر بھی کرتے ہیں۔ بجو کو بُرا سمجھتے ہیں اور بجو سے خواہ مخواہ ایک کہانی جوڑی گئی ہے اور اس جانور سے بچاؤ کی تدابیر کرتے رہتے ہیں۔ اختر رضا سلیمی نے اپنے ناول میں بیان کیا ہے "جوں ہی موت میری زندگی پر فتح پاتی، میری تازہ لاش کی مخصوص بو، جسے سونگھنے کی صلاحیت صرف بجوؤں کو حاصل ہے، ندی کے پانیوں پر تیرتی ہوئی، ان کے بلوں میں گھستی۔"[۵۸]

اس خطے کے لوگوں کے خیال میں تازہ لاش کو سونگھنے کی حس جو صرف بجوؤں میں ہی پائی جاتی ہے وہ سونگھ لیتے ہیں اور مردے کو اپنے ساتھ لے جاتے ہیں وہ مردے کو دوبارہ سے زندہ کرنے اور ساتھ لے جانے کے ہنر سے واقف ہیں اسی لیے جندروئی اپنے متعلق یہ خیال کرتا ہے کہ بجو میرے ساتھ بھی یہی سلوک کریں گے حالانکہ یہاں بھی حقیقت کا اس سے کوئی تعلق نہیں خواہ مخواہ بجو سے ایک توہم منسوب کر دی گئی ہے اور لوگ اپنی کم علمی اور کم عقلی کی وجہ سے اس پر ایمان رکھتے ہیں۔

گاؤں میں اسی طرح کی عجیب عجیب قسم کی وہم پرستیاں پائی جاتی ہیں اور لوگ تحقیق کیے بغیر ان توہمات پر ایمان لاتے ہیں۔ بد فالی لینا، بد شگونی کرنا، مختلف دنوں، مہینوں، تاریخوں کے علاوہ، چاند تاروں کی منزلوں سے تعین کرنااور تعویز، گنڈوں اور مختلف قبروں اور زیارات پر جاکر سبز رنگ کی چادریں اور دیگیں چڑھانااور وہاں جاکر منتیں ماننااور حاجت پوری ہونے پر ان منتوں کو باقاعدگی سے ادا کرنا ان کا بنیادی جزو تھا۔ ایک مرتبہ حضرت ابن عباس کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا"اچھی طرح جان لو کہ اگر پوری امت مل کر بھی تم کو فائدہ پہنچانا چاہے تو اس سے بڑھ کر نہیں پہنچا سکتی جتنا کہ اللہ نے تمہارے لیے لکھ دیا اور اگر پوری امت بھی تم کو نقصان پہنچانا چاہے تو اللہ نے جتنا لکھ دیا اس سے زیادہ نہیں پہنچا سکتی۔"(۵۹) یعنی یہ حاجت روائی اور منتوں پر یقین رکھنا اور مزاروں پر جاکر تالے لگانا، دھاگے باندھنا اور کسی درخت کو بابرکت سمجھ کر وہاں جاکر منتیں مانگنا، ہزارہ کی معاشرت میں جگہ جگہ نظر آتا ہے۔ جندر میں اختر رضا سلیمی نے اس علاقے کے اسی طرح کے ایک درخت کا ذکر یوں کیا ہے"کاہو کا بوڑھا درکٹ جس پر بہت عرصے تک لوگ منتیں مانگنے آتے رہے ہیں اور اب بھی اس کی شاخوں سے بندھے بے شمار جھنڈے لہرا رہے ہیں۔"(۶۰) پرانے درختوں کو بابرکت سمجھنا اور وہاں سبز چادریں چڑھانا اور درختوں کے نیچے کھڑے ہو کر دعا کرنے سے اگر پتا آپ کی گود میں گر جائے تو آپ کی گود بھر جائے گی اور اگر وہ پتا نہ گرا تو مطلب آپ نامراد لوٹیں گے۔ مختلف علاقوں میں ابھی بھی اس طرح کی توہمات پر یقین رکھتے ہیں۔ جیسے اس درخت پر علاقے کے زیادہ تر لوگ منتیں ماننے آتے ہیں اور یوں درختوں سے مختلف توہمات اپنے دل و دماغ میں جوڑ دیتے ہیں جس علاقے کی ثقافت ناول میں بیان کی گئی وہاں بھی اس طرح کی توہمات موجود ہیں جن کا ذکر اختر رضا سلیمی نے ذکر کیا۔

گاؤں میں لوگ کسی نہ کسی بات کو یا خرافات کو یونہی منحوس قرار دے دیتے ہیں یعنی کسی فرد کو یا کسی چیز کا اچانک آپ کی راہ میں آجانا یا کسی فرد سے خواہ مخواہ کوئی بات منسوب کر لینا اور اسے اپنے لیے خیر و شر سمجھنا ہزارہ کے لوگوں میں بھی عام نظر آتا ہے۔ ایسی ہی ایک توہم کا ذکر ناول میں یوں کیا گیا ہے۔"معلوم

نہیں کہ یہ میرے ماموں کی روح کی بد دعا تھی یا اتفاق، اس کی موت کے اگلے ہی سال علاقے میں ٹریکٹر اور تھریشر آ گئے۔"(۶۱)

ماموں کا جنازہ میں تمام لوگ صرف اس لیے شریک نہیں ہوئے تھے کیونکہ وہ گاؤں چھوڑ کر شہر آباد ہو گیا اور گاؤں کی کسی رسم میں شرکت نہیں کرتا تھا۔ اس لیے لیتری اور پہوچی جیسی رسومات اب ممکن نہیں رہی تھیں اور وہاں موجود لوگوں کا خیال تھا کہ اس کے جنازے میں شریک نہ ہونے کی وجہ سے اس کی روح نے بد دعا دے دی ہے اس لیے گاؤں میں تھریشر اور ٹریکٹر آ گئے تا کہ اب کوئی بھی ان رسومات کا حصہ نہ بن سکے اصل میں یہ محض ایک اتفاق اور وقت کا تقاضا تھا لیکن لوگوں نے اس کے مرنے کے بعد خواہ مخواہ اس سے یہ بات منسوب کر لی۔ جس کا حقیقت کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔

iii. اساطیر

ہمارے معاشرے میں خواہ مرد ہو یا عورت بوڑھا ہو یا جوان، بچے ہو یا خواہ کوئی انسانی وہ کسی بھی عمر سے تعلق رکھتا ہو، کہانی سننا اور کہانی کہنا دونوں اس کی جبلت یا فطرت میں شامل ہوں گے اور در حقیقت میں قصہ گوئی اور اساطیری واقعات ہی تہذیب انسانی کا اہم جزو ہیں۔ کوئی بھی انسان جب اپنی منزل کو پالیتا ہے تو وہ اپنے راہ میں آنے والی مشکلات و واقعات کو اپنے دوست احباب کو سناتا ہے اور یوں ہی انسان نے قصہ کہانیوں کی طرف توجہ دینا اور اس میں دلچسپی لینا شروع کی۔ ثقافت کے ساتھ ساتھ اگر مذہبی حوالے سے کہانی کی روایت کو پرکھا جائے تو تقریباً تمام مذہبی الہامی کتابوں میں ہمیں قصہ کہانیوں کی روایات کا ثبوت ملتا ہے۔ علی عباس حسینی نے اپنی کتاب ناول کی تاریخ و تنقید میں کچھ یوں رقمطراز ہیں:

> "قصہ گوئی اور داستان نگاری کا فن یقیناً بہت پرانا ہے اور زمین پر بھی سب سے پہلے جو قصہ ترتیب پایا وہ آدم و ہوا کے بیٹے اور بیٹی کا تھا۔ جو ٹریجک کامیڈی کی بنیاد بنا۔ چونکہ انسان ازل سے ہی قصے کہانیوں کا شوقین رہا ہے۔ اس لیے سماوی کتب میں بھی تمثیلی اسلوب اختیار کیا گیا ہے۔ جنھیں قصص القرآن کا نام دیا جاتا ہے۔ تخلیق آدم، فرشتوں

کا مکالمہ، ابلیس کا سجدے سے انکار، قرآن پاک کے ایسے واقعات ہیں جن میں واقعہ نگاری کے پورے لوازمات موجود ہیں۔"(۶۲)

لہٰذا ہم یہ کہہ سکتے ہیں قصہ کہانی اور اساطیر کا فن ہر گز بھی نیا نہیں ہے بلکہ یہ تشخیصی تہذیب و ثقافت کے ساتھ ساتھ پلتا رہا اور اس میں اضافہ ہوا ہے۔ اس فن قصہ گوئی کو انسانی تہذیب سے تعمیر کیا جائے تو بے جا نہ ہو گا۔ تہذیب کا گہوارہ اور تمدن سر چشمہ علاقوں سے یہ روایت چلتی ہوئی ہم تک پہنچتی ہے۔ اردو زبان و ادب میں بھی فن قصہ گوئی یعنی اساطیری واقعات انہی راستوں سے چلتے ہوئے ہم تک پہنچتے ہیں اور اس کا زیادہ تر سرمایہ داستانوں اور ناولوں پر مشتمل ہے۔ ملا وجہی کی سب رس، باغ و بہار، فسانہ عجائب اور اسی طرح کی متعدد داستانیں اس کی اہم مثالیں ہیں۔ ناولوں میں بھی زیادہ تر ناول نگاروں نے قاری کے لیے دلچسپی پیدا کرنے کے لیے اپنے ناولوں میں اساطیری واقعات کو بیان کیا ہے جو کہ ثقافت کا جزو ہے۔ زیرِ مطالعہ ناول "جندر" میں بھی اختر رضا سلیمی نے اپنے ناولوں میں اس طرح کے اساطیری واقعات کو جگہ دی ہے۔

"ان دنوں گاؤں کے دوسرے لوگوں کی طرح میں بھی گھوڑی ڈینچ نامی ایک خلائی مخلوق کی موجودگی پر یقین رکھتا تھا، جس کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ انسان سمیت ہر قسم کا روپ دھار لیتی ہے اور ہاتھ لگاتے ہی غائب ہو جاتی ہے۔ میرے بچپن کے دنوں میں بابا جمال دین نے گھوڑی ڈینچ کے حوالے سے مجھے بے شمار کہانیاں سنائی تھیں۔ ان میں سے زیادہ تر کہانیوں کا مرکزی کردار وہ خود ہی تھا۔ گھوڑی ڈینچ انسانوں کا بھیس بدل کر مجھے اکثر ستاتا اور ڈراتا رہتا ہے۔ مگر میرا دل مضبوط ہے اس لیے وہ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ اگر کبھی تمہارا اس سے سامنا ہو جائے تو ڈرنا مت، بس اسے ہاتھ لگانے کی کوشش کرنا۔ جوں ہی تم اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھاؤ گے وہ خود بخود غائب ہو جائے گا۔"(۶۳)

ہزارہ ثقافت کے لوگ اس واقعہ پر پورا ایمان رکھتے تھے اور ان کا خیال تھا کہ گھوڑی ڈینچ جانی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ مذہبی معاشرے میں بہت سے لوگ مسلمان ہونے کے باوجود اپنی کم علمی کی وجہ سے تعویز گنڈوا اس طرح کے خیالی جانوروں گھوڑی ڈینچ، جنوں اور پریوں پر یقین رکھتے ہیں اور اسی طرح کی کچھ ایسی باتیں، واقعات جو مافوق الفطرت ہوتے ہیں۔ وہ مشہور ہو جاتے ہیں اور لوگ اپنی کم علمی اور کم عقلی کی وجہ سے

انہیں من و عن قبول کر لیتے ہیں اور ان اساطیری واقعات پر کامل یقین رکھتے ہیں۔ انہیں واقعات میں سے ایک واقعہ گھوڑی ڈھینچ کا بھی ہے۔

اساطیری واقعات کا اہم مقصد تفریحی پہلو ہوتا ہے۔ اساطیر زیادہ تر تفریحی بھی ہوتے ہیں اور مافوق الفطرت بھی ہوتے ہیں۔ لوک کہانیاں جو مشہور ہو جاتی ہیں اکثر ماہرین نے لوک کہانیوں کو ہی اساطیر کا بدلا ہوا روپ کہا ہے۔ یہ تمام اساطیر اخلاقی دائرے کے گرد گھومتے ہیں۔ ان میں اخلاقیات کے ساتھ ساتھ کچھ ایسے واقعات بھی ان کے ساتھ جڑے ہوتے ہیں جن پر انسانی عقل کا یقین کرنا ممکن نہیں لیکن اختر رضا سلیمی نے ایسے واقعات کو اپنے ناول "جندر" میں بھی بیان کیا ہے۔

> "بزرگ نے اپنا منڈھا سا سر پر جمایا۔ آرام سے نیچے جھکے، قبل اس کے کہ میں بوری اٹھانے میں ان کی مدد کرتا، انھوں نے یک بارگی اسے اٹھایا اور بغیر کچھ کہے فوراً دروازے سے باہر نکل گئے اور میں حیرانی سے انھیں جاتے ہوئے دیکھتا رہ گیا۔ "پرانے زمانے کا بوڑھا ہے۔" آج کے نوجوانوں سے بھی جوان یہ سوچتے ہوئے میں دروازے کی طرف لپکا تاکہ اسے بند کر کے پیچھے لکڑی کا بالا ٹکاؤں اور آرام کروں۔ جوں ہی میں نے ستون سے آگے بڑھنے کے لیے قدم بڑھائے، میری ٹانگیں کسی چیز سے ٹکرائیں اور میں منہ کے بل زمین پر جا گرا۔ جب میں کچھ سنبھلا اور دیکھا تو دروازہ بند تھا اور اس کے پیچھے بالا بدستور ٹکا ہوا تھا۔ میں اسی سے ٹکرا کر گرا تھا۔ پہلے تو میں کافی دیر وہیں ششدر کھڑا رہا تھا اور پھر اسے کسی عجیب و غریب خواب پر معمول کر کے لیٹ گیا۔ کچھ دیر بعد میں نے کروٹ بدلی تو وہاں سفید ریش اجنبی بزرگ کی اتاری ہوئی بوری دیوار کے ساتھ ایستادہ دیکھ کر اپنی کٹائی ہوئی بوری نہ پا کر میرے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔"[۶۴]

بزرگ کا اچانک اس انداز سے آنا اور یوں ہی بغیر دروازہ کھلے نکل جانا اور اچانک ہی غائب ہو جانا یہ سب ماورائی باتیں ہیں جن پر یقین کرنا ایک عام قاری کے لیے ممکن نہیں لیکن اختر رضا سلیمی نے ناول میں

دلچسپی اور تسلسل قائم کرنے کے لیے اس کو بیان کیا ہے اور اس انداز میں در اصل وہ اس خطے میں مشہور ہونے والے ثقافتی اساطیر سے روشناس کرا رہے ہیں کیونکہ وہاں یہ اساطیر ہر عام بچے، بوڑھے، جوان سے سننے کو ملتے ہیں اس ناول میں اختر رضا سلیمی نے اس کا ذکر کیا۔ چونکہ جہاں گھوڑی ڈیچ اوراسی طرح کا ایک جانور بجو جس کے بارے میں وہ اسی طرح کی ایک کہانی مشہور ہے اور تمام لوگ اس پر مکمل بھروسہ کرتے ہیں اور گاؤں کا ہر فرد اس بجو کو جانتا ہے اور اس سے خوف زدہ ہے۔ ان کے اندر خوف وہراس صرف اس بجو سے منسوب ہے اسی طرح کا ایک اساطیری واقعہ ہے جس کا ذکر "جندر" میں ناول نگار نے کیا ہے۔

"بابا جمال دین کے بقول اگر مردے کو دفنانے کے بعد قبر پر کانٹے دار پھننگیں نہ رکھی جائے تو آدھی رات کے وقت بجو انسانی لاش کی بو پا کر قبرستان میں داخل ہوتا ہے اور اپنے پنجوں سے قبر کھود کر اس میں اتر تا جاتا ہے اور لاش کو اسی تنگ سوراخ میں سے گھسیٹ کر باہر نکالتا ہے اور پھر پاؤں کی طرف سے کفن پھاڑ کر ٹخنوں میں موجود اس رگ کو پکڑ کر مردے کو اپنے ساتھ چلا کر اپنے بل میں لے جاتا اور اپنی بیوی بچوں کے ساتھ اگلے تین چار دنوں میں اسے چٹ کر جاتا ہے۔"(۶۵)

اس خطے میں رہنے والے تمام لوگ اسی کہانی کو سچ مانتے ہیں اور اس پر یقین رکھتے ہیں اور اس بجو سے بچاؤ کے لیے مردے کے تمام عزیز و اقارب اس کی قبر پر کانٹے دار پھننگیں رکھتے ہیں جب تک قبر پکی نہ ہو جائے۔ وہ بجو سے اس طرح خوف زدہ نظر آتے جس طرح وہاں موجود لوگوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہو لیکن یہ سب اساطیر حقیقت سے دور دور تک ان کا کوئی واسطہ نہیں لیکن وہاں کی ثقافت میں یہ اساطیر بہت مشہور ہیں اور لوگ بجو کو اپنے مردہ عزیزوں کے لیے بہت خطرناک خیال کرتے ہیں اور اس سے بچاؤ کے مختلف اقدامات کرتے ہیں۔ اختر رضا سلیمی نے ناول "جندر" میں ہزارہ کے خطے میں مشہور اساطیر سے آگاہ کیا ہے انھوں نے ناول کے پلاٹ کو مد نظر رکھتے ہوئے کرداروں کے ذریعے اساطیری واقعات کو اس انداز میں بیان کیا ہے کہ پلاٹ میں ذرہ برابر بھی جھول نظر نہیں آتا اور قاری اس علاقے کے ثقافتی اساطیر کو آسانی سے جان لیتا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ ضیاءالحسن، ڈاکٹر، مشمولہ جندر ایک وجودی ناول، مکالمہ کراچی، کتابی سلسلہ ۳۶، مرتب مبین مرزا، لیزر پریس اردو بازار، کراچی، ستمبر ۲۰۱۷ء تا مئی ۲۰۱۸ء، ص ۱۶۹

۲۔ اختر رضا سلیمی، جندر، رمیل ہاوس آف پبلی کیشنز، راولپنڈی، اکتوبر ۲۰۱۷ء، ص ۲۱

۳۔ قدرت اللہ فاطمی (مشمولہ) پاکستانی ثقافت کی بنیادیں، مرتبہ رشید امجد، ۱۹۸۹ء، ص ۱۳۲

۴۔ اختر رضا سلیمی، جندر، ص ۲۱

۵۔ ایضاً، ص ۳۴

۶۔ ایضاً، ص ۴۸

۷۔ ایضاً، ص ۱۰۳

۸۔ ایضاً، ص ۹

۹۔ ایضاً، ص ۱۱

۱۰۔ ایضاً، ص ۳۸

۱۱۔ ایضاً، ص ۲۱

۱۲۔ ایضاً، ص ۸۹

۱۳۔ ثبات، شمارہ نمبر دوم، جنوری تا جون ۲۰۱۵ء، مدیر ارشد محمود ناشاد، ص ۲۷۴

۱۴۔ Edward B.Taylor primitive culture Vol.1 Joh Marry Ltd. London 1871, Page 1

۱۵۔ شیما مجید، فیض احمد فیض اور پاکستانی ثقافت، مرتبہ کراچی پاکستان اسٹڈی سینٹر، ۲۰۰۶ء، ص ۱۳

۱۶۔ اختر رضا سلیمی، جندر، ص ۳۲

۱۷۔ ایضاً، ص ۶۰۲

۱۸۔ ایضاً، ص ۵۹

۱۹۔ ایضاً، ص ۹۲

۲۰۔ ایضاً، ص ۲۴

۲۱۔ ایضاً، ص ۲۴

۲۲۔ ایضاً، ص ۱۲

۲۳۔ ایضاً، ص ۲۵

۲۴۔ ایضاً، ص ۲۶

۲۵۔ ایضاً، ص ۳۰

۲۶۔ سر سید احمد خان، اپنی تحریروں کے اپنے میں، اہل ہند کی ترقی تربیت، بنارس، ۲۰ ستمبر ۱۸۶۷ء، ص ۵۱۶

۲۷۔ شاہد احمد رزاقی، پاکستانی مسلمانوں کے رسوم و رواج، لاہور، ادارہ ثقافت اسلامیہ، ۱۹۶۵ء، ص ۲۰

۲۸۔ اختر رضا سلیمی، جندر، ص۹۴

۲۹۔ ایضاً، ص۹۸

۳۰۔ ایضاً، ص۹۹

۳۱۔ ایضاً، ص۵۶

۳۲۔ ایضاً، ص۱۷

۳۳۔ ایضاً، ص۵۹

۳۴۔ ایضاً، ص۶۹

۳۵۔ شاہد احمد رزاقی، پاکستانی مسلمانوں کے رسوم ورواج، لاہور، ادارہ ثقافت اسلامیہ، ۱۹۶۵ء، ص۲۰

۳۶۔ محمد صغیر خان، ڈاکٹر، پونچھ کی تہذیب وثقافت، کشمیر اکیڈمی مظفر آباد، آزاد کشمیر، مئی ۲۰۰۱ء، ص۳۰

۳۷۔ ایضاً، ص۱۱۳

۳۸۔ شاہد احمد رزاقی، پاکستانی مسلمانوں کے رسوم ورواج، لاہور، ادارہ ثقافت اسلامیہ، ۱۹۶۵ء، ص۳۰

۳۹۔ اختر رضا سلیمی، جندر، ص۱۵

۴۰۔ محمد صغیر خان، ڈاکٹر، پونچھ کی تہذیب وثقافت، کشمیر اکیڈمی مظفر آباد، آزاد کشمیر، مئی ۲۰۰۱ء، ص۱۱۱

۴۱۔ اختر رضا سلیمی، جندر، ص۳۶

۴۲۔ ایضاً، ص ۳۰

۴۳۔ ادب کلچر اور مسائل، مجموعہ تنقیدی مضامین، مرتبہ خاور جمیل رائل بک کمپنی کراچی، ۱۹۸۶ء، ص ۳۹۶

۴۴۔ Noted toward the definition of culture، ٹی، ایس ایلیٹ، فیبر انڈ فیبر لندن، ۱۹۶۱ء، ص ۲۷

۴۵۔ سید عبداللہ، کلچر کا مسئلہ، غلام علی اینڈ سنز، لاہور، ۱۹۷۷ء، ص ۱۱۹

۴۶۔ اختر رضا سلیمی، جندر، ص ۱۱

۴۷۔ شاہد احمد رزاقی، پاکستانی مسلمانوں کے رسوم ورواج، لاہور، ادارہ ثقافت اسلامیہ، ۱۹۶۵ء، ص ۲۳۰۔۲۳۱

۴۸۔ سید احمد دہلوی، مولوی، مولف، فرہنگ آصیفہ، جلد سوم، سنگ میل پبلی کیشنز، اردو بازار، لاہور، ۲۰۰۲ء، جلد سوم، ص ۳۰۶

۴۹۔ اختر رضا سلیمی، جندر، رمیل ہاوس آف پبلی کیشنز، راولپنڈی، اکتوبر ۲۰۱۷ء، ص ۱۰۲

۵۰۔ شاہد احمد رزاقی، پاکستانی مسلمانوں کے رسوم ورواج، لاہور، ادارہ ثقافت اسلامیہ، ۱۹۶۵ء، ص ۱۳۲

۵۱۔ اختر رضا سلیمی، جندر، ص ۱۰۲

۵۲۔ ایضاً، ص ۹۳

۵۳۔ ایضاً، ص ۹۷

۵۴۔ ایضاً، ص۹۸

۵۵۔ سورۃ النساء، آیت نمبر۸۶، سپارہ نمبر۵، رکوع نمبر۸، منزل نمبر۲

۵۶۔ اختر رضا سلیمی، جندر، ص۸۰

۵۷۔ ایضاً، ص۶۶

۵۸۔ ایضاً، ص۱۸

۵۹۔ ترمذی۲۴۵۳

۶۰۔ اختر رضا سلیمی، جندر، ص۳۵

۶۱۔ ایضاً، ص۹۹

۶۲۔ علی عباس حسینی، ناول کی تاریخ و تنقید، لاہور اکیڈمی، لاہور، ۱۹۶۴ء، ص۲۳

۶۳۔ اختر رضا سلیمی، جندر، ص۴۸

۶۴۔ ایضاً، ص۱۷

۶۵۔ ایضاً، ص۴۵

باب چہارم:

مجموعی جائزہ اور سفارشات

الف: اختر رضا سلیمی کے ناولوں میں ثقافتی عناصر، مجموعی جائزہ

ناول در حقیقت میں کسی بھی معاشرے کا آئینہ دار ہو تا ہے۔ ناول میں معاشرے کے عادات و اطوار رسوم ورواج اور معاشرے کے عکاس کر دار ہی کرتے نظر آتے ہیں۔ ناولوں میں معاشرتی اور سماجی زند گی کی عکاسی ہوتی ہے۔ ناول کسی خطے یا علاقے کی ثقافتی اور تہذیبی زند گی کو اپنے کر داروں کے ذریعے اجاگر کر تا ہے۔ کر دار سے لے کر ماحول تک غرض تمام اشیاء معاشرت سے بلاواسطہ یا بالواسطہ تعلق ضرور رکھتی ہیں خواہ فنی لحاظ سے ہو یا فکری لحاظ سے۔ اکثر اوقات ناول نگار تہذیبی و ثقافتی ورثے کو منتقل کرنے کے لیے بھی اور اسے دلچسپ انداز میں دوسرے خطوں تک پہنچانے کے لیے ناول کو ہی بہترین ذریعہ اظہار خیال کرتے ہیں۔ اختر رضا سلیمی نے بھی اپنے ناولوں میں ہزارہ کی ثقافت کو بیان کیا ہے۔ ثقافت کا بہترین اظہار جغرافیائی اور مذہبی لحاظ سے ہوتا ہے۔ کسی خطے کے جغرافیائی اور مذہبی عناصر کا اظہار ثقافت کہلاتا ہے۔ اختر رضا سلیمی نے اپنے دونوں ناولوں میں جس علاقے کی ثقافت کو بیان کیا ہے وہاں انھوں نے جغرافیائی لباس، بود و باش، رسوم وروایات اور مذہبی واعتقادی مآخذات کو بھی بیان کیا ہے ان کے کر دار اور ماحول کا اس علاقے کی ثقافت سے بہترین امتزاج نظر آتی ہے ان کے کر دار ان کے ماحول کے عکاس ہیں کیونکہ اس ماحول کا تعلق دیہات سے ہے تو وہاں ان کے کر دار ماحول کے عکاس نظر آتے ہیں۔ گاؤں چونکہ ایک زرعی علاقہ ہے وہاں گندم، مکئی کی کاشت کرتے کر دار نظر آتے ہیں اس کے علاوہ لوگ پالتو جانور پالتے ہیں گاؤں کے لوگ بنیادی ضروریات دودھ، دہی، مکھن، گھی وغیرہ جانوروں سے حاصل کرتے ہیں جو اس ناول میں جگہ جگہ جانور، جندر اور اس طرح کی اشیاء نظر آتی ہیں جو خالصتاً دیہات سے تعلق رکھتے ہیں۔

ثقافت میں جغرافیائی حوالے سے اہم چیز لباس ہے۔ اختر رضا سلیمی نے اپنے ناولوں میں جغرافیائی ثقافتی عناصر کو بیان کرتے ہوئے لباس کو بہت موثر انداز میں برتا ہے۔ ناولوں میں موجود کردار ماحول کے ساتھ ساتھ لباس میں بھی اپنے علاقے کے عکاس نظر آتے ہیں کیونکہ وہ ایک پہاڑی علاقہ ہے اور وہاں سردی زیادہ ہونے کی وجہ سے لوگ مخصوص لباس کا استعمال کرتے ہیں مثلاً اون کے لیدر کے کپڑے زیادہ تر استعمال کرتے ہیں جس میں برفباری ہونے کی وجہ سے پڑھنے والی موسمی درجہ حرارت نقطہ انجماد سے گر جاتا ہے جس کی وجہ سے سردی بڑھ جاتی ہے لوگ اون اور لیدر کا استعمال زیادہ کرتے ہیں دونوں ناولوں کے لباسوں کو بغور دیکھا جائے تو دونوں ہی میں ایسے لباس کا استعمال زیادہ ہے۔ اختر رضا سلیمی نے کرداروں کے لباس کو بھی موقع کی مناسبت سے بھی استعمال کیا۔ ناول "جاگے ہیں خواب میں" ڈاکٹر مسیح الدین فاروقی جو کہ بیرونِ ملک سے آیا اس کا لباس بھی ناول میں ویسا ہی دکھایا گیا ہے۔ ہر علاقے کے رہنے والے اپنے علاقے کے جغرافیائی اور ماحول کو مدنظر رکھتے ہوئے لباس کا انتخاب کرتے ہیں۔ ناولوں میں سفید لباس کو عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے جو ناول میں اکثر کرداروں نے پہنا ہوا ہے۔ وہاں لوگ چادر کا استعمال بھی زیادہ کرتے ہیں اور اسے عزت و آبرو کی علامت سمجھتے ہیں۔ "جاگے ہیں خواب میں" ایک ضخیم ناول اس میں کردار "جندر" کی نسبتاً زیادہ ہے اس لیے یہاں جغرافیائی عنصر لباس کو زیادہ موثر انداز میں برتا گیا ہے لیکن جندر میں چونکہ ایک فرد کی کہانی ہے اور داخلی جذبات کا اظہار زیادہ نظر آتا ہے اس میں ضمنی کردار بھی "جاگے ہیں خواب" کی نسبتاً کم نظر آتے ہیں اس لیے یہاں لباس کی روایت کو موثر انداز میں برتا جاسکا۔

دیہات میں شادی بیاہ کے موقعے پر بھی لباس پر زیادہ خرچ نہیں کیا جاتے اور وہاں کے ثقافتی اعتبار سے بھی لوگ زیادہ رسومات بھی ادا نہیں کرتے جس کی وجہ سے لباس اور نمود و نمائش کم ہی نظر آتی ہے۔ ناول میں کرداروں کے لباس ان کے عہدے کے اعتبار سے ہی پہنائے گئے ہیں جس طرح ڈاکٹر مسیح الدین فاروقی جب مہاراجہ اشوک کے جیسا لباس پہن کر آئے تو لباس ہی کی وجہ سے انہیں ناول کے ہیرو زمان نے مہاراجہ اشوک سمجھا اور زمان جب گاؤں جاتا تو اپنے علاقے کی مناسبت سے سفید لباس پہنے نظر آتا ہے لیکن

شہر میں آکر وہ شہری لباس جینز اور شرٹ ہی پہنتا ہے۔ ثقافتی اور مذہبی اعتبار سے سفید لباس کی اپنی اہمیت ہے جب کوئی اسلامی معاشرے میں فرد مرتا ہے تو اسے سفید رنگ کا ہی لباس پہنایا جاتا ہے جسے کفن کہتے ہیں کیونکہ اس ناول کے پس منظر میں اسلامی معاشرے کی عکاسی نظر آتی ہے۔ اس لیے ان ناولوں میں مُردوں کے لباس سفید دکھائی دیتے ہیں۔ الغرض لباس کے حوالے سے اختر رضا سلیمی نے اپنے دونوں ناولوں میں جہاں جہاں ممکن تھا اپنے کرداروں کے لباس کی تفصیل بیان کرنے کی کوشش کی ہے انہوں نے لباس کی تفصیل ناولوں میں اس حد تک بیان کر دی گئی ہے کہ اس کا جغرافیائی مآخذ لباس واضح ہو گیا ہے اور اس علاقے کی ثقافتی مآخذ لباس کی پہچان ہو گئی ہے کہ وہاں کے رہنے والے لوگ کس طرح کے لباس استعمال کرتے ہیں۔ دونوں ناولوں میں مختلف کردار ہیں۔ اختر رضا سلیمی نے کرداروں کو ان کے ماحول کے مطابق ڈھالتے ہوئے حالات کو مدِ نظر اور ان کی سماجی حیثیت کو بھی لباس کے ذریعے اجاگر کیا ہے۔ ان کی سماجی اور معاشی و معاشرتی حیثیت کے پیشِ نظر ان کے لباس کا انتخاب کیا ہے۔ مثلاً باہر سے آنے والا ڈاکٹر اور جندروئی کا بیٹا راحیل جو شہر میں ایک اچھا مقام رکھتے ہیں ان کے لباس اسی مناسبت سے نظر آتے ہیں اور گاؤں میں رہنے والے عام لوگ جو اپنی چادر کو صرف اوڑھنے کے لیے ہی نہیں بلکہ بطور رسی بھی استعمال کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ دونوں ناولوں میں کئی جگہ وہ لباس کی تفصیل بہت زیادہ بیان کرتے ہیں لیکن کئی جگہ اختصار سے کام لیتے ہوئے وہ اس کی وضاحت سے گریز کرتے دکھائی دیتے ہیں۔

جغرافیائی مآخذ میں لباس کے بعد سب سے اہم چیزیں اس خطے کا رہن سہن یعنی بود و باش ہے۔ ہر خطے کا یا علاقے کا رہن سہن، بود و باش مختلف ہوتا ہے جس طرح شہری زندگی اور دیہاتی زندگی میں ایک واضح فرق دکھائی دیتا ہے اسی طرح ہر علاقے کے رہن سہن مختلف ہوتا ہے۔ خواہ وہ دیہات ہی کیوں نہ ہوں۔ میدانی علاقے اور پہاڑی علاقوں میں اور ہر علاقے کی بود و باش مختلف ہوتا ہے۔ اختر رضا سلیمی کے دونوں ناولوں میں دیہات نگاری نمایاں ہے اور دیہاتی علاقے کی ثقافت بیان کی گئی ہے۔ بود و باش کے حوالے سے دیکھا جائے تو دونوں ناولوں میں دیہاتی طرزِ ثقافت نظر آتی ہے۔ دیہات میں لوگ لکڑیاں استعمال کرتے ہیں۔ وہاں لکڑی

ہر گھر کی بنیادی ضرورت ہے۔ لکڑی سے آگ، گھروں کے دروازے، دستکاریاں وغیرہ بنائی جاتی ہیں جو اس علاقے میں کثرت سے پائی جاتی ہیں اس کے علاوہ گاؤں میں لوگ سادہ غذائیں کھاتے ہیں وہاں لوگ گھی، دودھ، دہی وغیرہ پی لیتے ہیں اور کھانے میں ساگ کا استعمال کرتے ہیں۔ اختر رضا سلیمی کے دونوں ناولوں میں ان علاقوں کی بود وباش کو بیان کیا ہے جہاں جہاں کرداروں کے رہن سہن کو بتانا ممکن تھا وضاحتی انداز میں بیان کیا ہے اور ان کے رہن سہن کو اجاگر کیا ہے۔ دونوں ناولوں میں ایک دوسرے کا خاص خیال نظر رکھتا ہے۔ لوگ ایک دوسرے کے انفرادی اور معاشی دونوں حالات سے بخوبی واقف نظر آتے ہیں اور ان کے خیالات اور رہن سہن سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ وہ خالصتاً گاؤں کے رہنے والے ہیں جہاں پیدل چلنا، ہل چلانا، مختلف عورتوں مردوں کا اکٹھے مل جل کر کام کرنا اور گاؤں میں جندر کا لگنا عام ہے۔ وہ ان لوگوں کے ماحول کا حصہ ہے لیکن "جاگے ہیں خواب میں" اختر رضا سلیمی نے دونوں علاقوں کی بود وباش کو بیان کیا ہے وہاں شہری زندگی بھی نظر آتی ہے اور گاؤں کی ثقافت ہے۔ شہر میں اسلام آباد کی سڑکیں صاف ستھری اور پکی اور اشارہ مڑنے یہ سارجنٹ کا چلان کرنا، یونیورسٹی میں ماہ نور سے اس کی ملاقات یعنی کہ یونیورسٹی میں لڑکی اور لڑکوں کو اکٹھے بیٹھنا کو بُرا نہیں سمجھا جاتا یہ شہری طرزِ زندگی ہے جس کو اختر رضا سلیمی نے اپنے ناول میں وضاحتی انداز میں بیان کیا ہے لیکن اس کے مقابلے میں جندر میں شہری زندگی کی عکاسی بہت کم نظر آتی ہے۔ "جاگے ہیں خواب میں" دیہاتی زندگی کے ہر رنگ ڈھنگ کو بیان کیا گیا لیکن جندر میں نسبتاً کم ہے۔

ثقافتی اظہار کے لیے جغرافیائی مآخذ کا ایک اہم عنصر رسوم و روایات ہیں ہر علاقے کی برادریوں کے رسم و روایات ایک دوسرے سے کسی حد تک مختلف ہوتے ہیں لیکن زیادہ تر علاقے کے رسوم و روایات ایک دوسرے سے مکمل طور پر مختلف ہوتے ہیں۔ اختر رضا سلیمی نے ہزارہ کی ثقافت کو بیان کرتے ہوئے دونوں ناولوں میں اس علاقے کی بود وباش کے ساتھ ساتھ وہاں ہونے والی تمام رسوم و روایات کو موثر انداز میں ساتھ ساتھ بیان کیا ہے اور تمام رسومات کے مظاہر اور طور طریقے سے بھی آگاہ کیا ہے جس سے معلوم ہونے والی تمام رسومات کو سمجھنے میں کسی قسم کی دقت محسوس نہیں ہوتی۔ اور اگر کوئی ایسی رسومات ہیں جو صرف اس

علاقے کا خاصا ہیں تو اس کو ناول میں موجود کرداروں کی گفتگو کے ذریعے ہی انہیں واضح کر دیا ہے۔ مثلاً جندر میں موجود رسم پہوچی اور لیتری ایسی رسومات ہیں جو پہلی دفعہ سننے والا اس رسم کو بہتر طریقے سے نہیں جان سکتا ہے لیکن ناول پڑھتے پڑھتے ہی آپ کو ان رسومات کی آگاہی ہو جاتی ہے کہ یہ رسم کیوں بنائی گئی اور اس رسم سے تمام گاؤں کے لوگ ایک دوسرے سے جڑے رہتے ہیں۔ ناول "جاگے ہیں خواب میں" بھی اس طرح کی رفاعی رسومات ہیں جن کی وجہ سے لوگ ایک دوسرے کے ساتھ جڑے رہتے ہیں اور ایک دوسرے کے حالات سے بھی آگاہ ہوتے ہیں۔ شادی بیاہ میں ہونے والی تمام رسومات کو اختر رضا سلیمی نے بیان کیا ہے۔

نکاح ایک مذہبی رسم ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ متعدد وہ رسومات جو صرف علاقائی رسمیں ہیں ان کو بھی اپنے ناول میں بیان کیا ہے۔ گاؤں میں عرس کا ہونا اور اس کا آغاز بڑے بزرگوں کے ہاتھوں سے کرنا اور اس طرح کی تمام رسومات کو اختر رضا سلیمی نے اپنے ناولوں میں بیان کیا ہے۔ جب کوئی بزرگ مر جائے تو اس کی قبر پر مزار بنا دینے کی رسم ہر حال میں مرید نبھاتے ہیں اور اس کا بہت عزت و احترام کرتے ہیں اور مزاروں کو باقاعدہ دربار بنا دیا جاتا ہے جہاں لوگ آکر اپنی منتیں مانگتے ہیں۔ اس علاقے میں لوگ درباروں کی دیکھ بھال کرنا فرض عین سمجھتے ہیں اور باقاعدہ مزاروں پر لنگر دیتے ہیں۔ لیکن "جاگے ہیں خواب میں" جب بزرگ سید احمد بریلوی نے جب ان کی معاشرتی رسومات سے انکار کیا تو انہوں نے ان کی باتوں کو نظر انداز کر کے اپنی رسومات کو اپنانے کو ترجیح دی۔ اس علاقے کی اہم رسم یہ ہے کہ جب کوئی مر جائے تو کاہو کے بزرگ ترین درخت کے تختے نکالے جاتے ہیں اور قبر کے لیے استعمال کیا جاتا ہے لیکن جندر میں اس طرح کی رسومات کی تفصیل نسبتاً کم ہے کیونکہ وہ ناول اس قدر ضخیم نہیں ہے اور اس کے ساتھ ساتھ وہاں رسومات کی بھرمار نظر نہیں آتی جس طرح "جاگے ہیں خواب" میں نظر آتی ہے۔ اختر رضا سلیمی نے دونوں ناولوں میں رسومات کو واضح انداز میں بیان کیا ہے۔

ثقافتی اقدار میں جغرافیائی مآخذ کی ایک اہم قدر علوم و فنون ہے۔ ثقافت داخلی احساسات کے علاوہ دوسرے علاقے کا چہرہ دکھانے میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ کسی علاقے کے علوم و فنون سے ان کی تہذیبی

ورثے کا پتا چلتا ہے۔ اختر رضا سلیمی کے دونوں ناولوں میں ہزارہ کی ثقافتی دستکاریوں کا تذکرہ موجود ہے اور جندر نام ہی سے ایک ثقافتی دستکاری کا احساس ہوتا ہے جو پرانی تہذیب میں معدوم ہو چکی ہے۔ دونوں ناولوں میں گھر کی آرائش و زیبائش سے لے کر گلی کوچوں راستوں میں بھی علوم و فنون کی بھرمار دکھائی دیتی ہے۔ "جاگے ہیں خواب میں" ناول میں جندر ناول کے مقابلے میں زیادہ واضح عکس نظر آتا ہے وہاں ہاتھ سے بنی جگہ جگہ تصویریں، گھروں کی کھڑکیاں، دروازے اور دیواروں اور ستونوں پر بنے نقش و نگار زیادہ وضاحت کے ساتھ موجود ہیں جبکہ جندر میں چونکہ گھروں کا تذکرہ نسبتاً کم ہے وہاں جس جندروئی ولی محمد کو مرکزی کردار ملا ہے وہ ایک گاؤں کا سادہ، غریب طرزِ زندگی گزارنے والا فرد ہے اس لیے وہاں ایسے گھر کی آرائش و زیبائش نظر نہیں آتی۔

ثقافت کے مآخذات میں مذہب کا نام بطور خاص لیا جاتا ہے۔ ہر علاقے کی ثقافت میں کسی نہ کسی مذہب کا عکس ضرور نظر آتا ہے جسے تمام لوگ بغیر کسی حیلے و محبت کے مانتے ہیں۔ اختر رضا سلیمی کے دنوں ناولوں میں مذہب اسلام کی عکاسی نظر آتی ہے اس لیے ان میں اسلامی رسومات زیادہ ہیں۔ مذہب اسلام میں سلام کرنا، نماز و روزہ کی پابندی، نکاح کرنا، مردہ کو قبر میں دفن کرنا، اس کے کفن اور باقاعدہ نماز جنازہ پڑھنا، اس کے مرنے کے بعد سوئم اور چہلم وغیرہ جیسی رسومات ادا کرنا بالخصوص اسلامی معاشرے کا ہی وصف ہے۔ اختر رضا سلیمی کے دونوں ناولوں ان رسومات کو بہت زیادہ تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ ان دونوں ناولوں میں کرتے ہوئے قطعاً یہ معلوم کرنا مشکل ہے کہ ایک ناول کی نسبت دوسری میں یہ رسومات کم نظر آتی ہیں۔ دونوں ناولوں بھلے وہ کسی فرد کی آپ بیتی ہو یا ہزاروں کرداروں کا مجمع نظر آئے لیکن اختر رضا سلیمی چونکہ خود بھی اسی جگہ سے تعلق رکھتے ہیں اور مذہب اسلام کو مانتے ہیں اسی لیے ان کے دونوں ناولوں میں مذہبی رسومات کے حوالے سے بات کرتے ہوئے ان کا قلم کہیں نہیں رکھا البتہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ جندر ناول میں انھوں نے رسومات کا تذکرہ کرتے ہوئے اختصار سے کام لیا ہے جبکہ " جاگے ہیں خواب میں" ناول میں رسومات کے عمل کے حوالے سے متعدد جگہ بات کی ہے لیکن انھوں نے تمام رسومات کا ذکر دونوں ناولوں

میں کیا ہے ان تمام رسومات کو بیان کرتے ہوئے کسی بھی جگہ وہ مذہبی انتہا پسند نظر نہیں آتے ہیں بلکہ معمولی انداز میں بیان کرتے ہوئے گزر جاتے ہیں۔

توہمات ہمارے معاشرے کا اہم حصہ ہیں۔ ہمارے خطے کی ثقافت میں توہمات کی جگہ بہت زیادہ ہے حالانکہ یہ اسلامی معاشرہ ہے لیکن یہاں ایسے لوگ موجود ہیں جو توہمات پر یقین رکھتے ہیں جس علاقے کی ثقافت کو اختر رضا سلیمی نے اپنے ناولوں میں بیان کیا ہے وہاں بھی لوگ توہمات پر بہت زیادہ یقین رکھتے ہیں چونکہ وہ گاؤں ہے۔ اور گاؤں میں توہم پرستی بہت زیادہ ہوتی ہے وہاں لوگ بہت سی من گھڑت باتیں اپنے دل و دماغ میں بیٹھا لیتے ہیں اور گاؤں کے ناصح العقیدہ لوگ اس پر ایمان لانے کے ساتھ ساتھ ان من گھڑت باتوں کو معیوب بھی سمجھتے ہیں اور اپنی زندگیوں میں ان باتوں سے خواہ مخواہ باتیں جوڑ لیتے ہیں۔ اختر رضا سلیمی کے دونوں ناولوں میں چونکہ دیہات نگاری بہت زیادہ ہے ان دونوں ناولوں میں بہت سی ایسی توہمات جگہ جگہ دکھائی دیتی ہیں جن پر ہری پور ہزارہ کے لوگ یقین رکھتے ہیں۔ بلیوں کا رونا، کتوں کا آسمان کی طرف منہ کر کے بھونکنا، گیدڑوں کا رونا، بارشوں میں الٹی قمیض پہن کر گھومنا اور بارش کا تیزی سے لگاتار برسنا وغیرہ ایسی متعدد توہمات دونوں ناولوں میں نظر آتی ہیں۔ دونوں ہی ناولوں میں توہمات کا ذکر کافی حد تک زیادہ ہے اس کے علاوہ منتیں ماننا، درختوں کی خاص قسم کو معتبر سمجھنا وغیرہ۔ دونوں ناولوں میں موجود کرداروں کی باہمی ذاتی گفتگو میں توہمات پرستی بہت عام ہے۔ پڑھے لکھے لوگ بھی کسی نہ کسی حد تک توہم پرستی کا شکار نظر آتے ہیں۔ "جاگے ہیں خواب میں" چونکہ قصہ طویل ہے اور بہت سی ضمنی قصے بھی ہیں جس کی وجہ سے اس ناول میں کثیر توہمات موجود ہیں لیکن جندر ناول میں ایک ہی فرد کی طویل کہانی نظر آتی ہے اور ضمنی کہانیاں بھی مختصر ہیں اس لیے اس ناول میں توہمات کم ہیں۔

ثقافت میں اعتقادی مآخذ کے حوالے سے اساطیر بنیادی جزو ہے۔ اساطیر سے مراد کوئی بھی واقعہ یا قصہ ہوتا ہے جس انسانی عقل کے معیار پر بھلے پورا نہ اترے لیکن لوگ اس پر یقین رکھتے ہیں۔ اساطیر ہر علاقے کا خاصہ ہوتے ہیں ہماری ثقافت میں قصہ گوئی کی روایت کئی سالوں پر محیط نظر آتی ہے۔ اساطیر میں

مافوق الفطرت اور حقیقی کر دار ہوتے ہیں ۔ اختر رضا سلیمی نے اعتقادی مآخذ بیان کرتے ہوئے اساطیری واقعات کو اپنے ناولوں میں بیان کیا ہے ۔ دونوں ناولوں میں ایسے واقعات نظر آتے ہیں جو انسانی زندگی سے جڑے ہوئے ہیں لیکن انسانی عقل اسے ماننے سے قاصر نظر آتی ہے مثلاً "جندر "ناول میں جندر کے ایک پاٹ کو دس افراد بھی بمشکل اٹھاتے ہیں وہ اٹھا کر چلنا نا ممکن ہے لیکن جندر ناول میں دو بھائی جندر کا پاٹ اٹھا کر میلوں کا سفر طے کرتے ہیں اور کہیں رکتے نہیں۔ اسی طرح ناول میں بجو، گھوڑی ڈینچ، اور ایک فرد کے اندر غیر مری قوتیں ایسی متعدد اساطیری باتیں نظر آتی ہیں جو ہزارہ میں بہت مشہور ہیں اور بچہ بچہ ان باتوں کو جانتا ہے اور ان پر یقین رکھتا ہے۔ "جاگے ہیں خواب میں " بھی ایسے واقعات بہت طوالت سے ساتھ موجود ہیں۔ اساطیر میں مافوق الفطرت واقعات بھی ہوتے ہیں اختر رضا سلیمی کے دونوں ناولوں میں جن پری دیو مالائی واقعات آسیب کا تذکرہ کیا ہے اور اسی طرح کا ایک طویل واقعہ جو کہ ہزارہ میں بہت مشہور ہے وہ بھی بیان کیا ہے۔ انھوں نے ان ناولوں میں اس علاقے کے تمام اساطیری واقعات کو بیان کیا ہے جو کہ زبان زد ہیں۔

انھوں نے تمام ثقافتی مظاہر خواہ وہ جغرافیائی ہو یا اعتقادی موثر انداز میں بیان کیا ہے اور کرداروں کے ذریعے ماحول اور تمام مآخذات لباس، رسوم وروایات، توہمات واساطیر وغیرہ جو کہ اس علاقے کی ثقافت کو اجاگر کرتے ہیں کی تفاصیل بیان کی ہیں۔

ب: نتائج

مجموعی طور پر اس تحقیق سے درج ذیل نتائج سامنے آتے ہیں:

ا۔ ثقافت کے بنیادی عناصر کو مادی اور غیر مادی دو حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ مادی عناصر میں علوم وفنون، دستکاریاں، بود وباش، لباس وغیرہ شامل ہیں جبکہ غیر مادی اشیا میں اساطیر، قصہ گوئی، رسومات، اقدار، عادات واطوار وغیرہ شامل ہیں۔ ثقافت کے ماخذات جغرافیہ اور اعتقادات ہیں۔

۲۔ زیر تحقیق ناولوں میں ہزارہ کی ثقافت کو بیان کیا گیا ہے۔ ناول نگار نے دونوں ناولوں میں ثقافت کے مختلف عناصر کو مؤثر انداز میں جزئیات کے ساتھ بیان کیا ہے۔

۳۔ زیر تحقیق ناولوں میں اعتقادی ماخذات سے جنم لینے والے ثقافتی عناصر کو ایسے رچاؤ سے بیان کیا گیا ہے کہ ہزارہ کے خطے کی امتیازی خصوصیات اجاگر ہو کر سامنے آئی ہیں۔

۴۔ ثقافت کے جغرافیائی ماخذات کے ضمن میں اس خطے کی حیثیت اب تک کے اردو ناولوں میں پیش کیے گئے عناصر سے منفرد ہے۔

ج۔سفارشات

۱۔ گزشتہ دو عشروں میں اردو ناولوں کی ایک نئی کھیپ سامنے آئی ہے، ثقافتی عناصر کے حوالے سے ان پر بھی تحقیقی کام ہونا چاہیے۔

۲۔ معاصر اردو ناولوں میں ثقافتی عناصر کے حوالے سے تقابلی مطالعات کی ضرورت ہے تاکہ مختلف خطوں کا لینڈ سکیپ دکھاتے ہوئے امتیازات اجاگر کیے جا سکیں۔

کتابیات

بنیادی مآخذ

اختر رضا سلیمی، جاگے ہیں خواب میں، دستاویز، لاہور، ۲۰۱۵ء

اختر رضا سلیمی، جندر، رمیل ہاؤس آف پبلی کیشنز، راولپنڈی، اکتوبر ۲۰۱۷ء

ثانوی مآخذ

القرآن

جمیل جالبی، ڈاکٹر، ادب کلچر اور مسائل ، مجموعہ تنقیدی مضامین، مرتبہ خاور جمیل رائل بک کمپنی کراچی، ۱۹۸۶ء

جمیل جالبی، ڈاکٹر، پاکستانی کلچر، نیشنل بک فاؤنڈیشن اسلام آباد، ۱۹۹۷ء

جمیل جالبی، ڈاکٹر، قومی انگریزی اردو لغت، مقتدرہ قومی زبان، ۲۰۰۸ء

سر سید احمد خان، اپنی تحریروں کے اپنے میں، اہل ہند کی ترقی تربیت، بنارس، ۲۰ ستمبر ۱۸۶۷ء

سہیل بخاری، ڈاکٹر، اردو داستان تحقیقی و تنقیدی مطالعہ، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، طبع اول، ۱۹۸۷ء

سورۃ النساء، آیت نمبر ۸۶، سپارہ نمبر ۵، رکوع نمبر ۸، منزل نمبر ۲

سید احمد دہلوی، مولوی، مولف، فرہنگ آصفیہ، جلد چہارم سنگ میل پبلی کیشنز، اردو بازار، لاہور، ۲۰۰۲ء

سید عبد اللہ، کلچر کا مسئلہ، غلام علی اینڈ سنز، لاہور، ۱۹۷۷ء

شاہد احمد رزاقی، پاکستانی مسلمانوں کے رسوم و رواج، لاہور، ادارہ ثقافت اسلامیہ، ۱۹۶۵ء

شیما مجید، فیض احمد فیض اور پاکستانی ثقافت، مرتبہ کراچی پاکستان اسٹڈی سینٹر، ۲۰۰۶ء

عبدالرحمٰن خان، منشی دورِ جدید کے عالمگیر فتنے، جاوید اکیڈمی، ملتان، ۱۹۸۰ء

عبدالمجید، خواجہ (مؤلف)، جامع اللغات، اردو سائنس بورڈ، لاہور، جلد اول، ۱۹۸۹ء

عثمان فاروق، ڈاکٹر، اردو ناول میں مسلم ثقافت، بیکن ہاؤس، لاہور، ۲۰۰۲ء

عظیم الشان صدیقی، اردو ناول کا آغاز وارتقا، ۱۹۱۴ء تا ۱۸۱۵ء، بک ٹک، لاہور، ۲۰۱۹ء

علی عباس حسینی، ناول کی تاریخ و تنقید، لاہور اکیڈمی، لاہور، ۱۹۶۴ء

محمد صغیر خان، ڈاکٹر، پونچھ کی تہذیب و ثقافت، کشمیر اکیڈمی مظفر آباد، آزاد کشمیر، مئی ۲۰۰۱ء

نذیر احمد، توبۃ النصوح، مرتبہ افتخار احمد صدیقی، مجلس لاہور، ۱۹۶۴ء

نصیر احمد، ڈاکٹر، اسلامی ثقافت فیروز سنز لمیٹڈ، لاہور، راولپنڈی، س ن

نظیر صدیقی، تفہیم و تعبیر، ملتان، کارواں ادب، ۱۹۸۳ء

وزیر آغا، ڈاکٹر، تخلیقی عمل، مکتبہ اردو زبان، سرگودھا، ۱۹۷۰ء، ص ۵۱

Edward B.Taylor primitive culture Vol.1 Joh Marry Ltd. London,1871

رسائل و جرائد

اسلامک کلچر (انگریزی) مصنف ڈاکٹر ایس ایم یوسف انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک کلچر، ۱۹۷۸ء

ثبات، شمارہ نمبر دوم، جنوری تا جون ۲۰۱۵ء، مدیر ارشد محمود ناشاد،

خالد سعید، ڈاکٹر، (نگران اعلیٰ) اقبال کا نظریہ ثقافت فرحان فتح پوری، ڈاکٹر، مضمون شعبہ تحقیق و مطبوعات ادارہ ثقافت پاکستان، اسلام آباد، جون ۱۹۸۲ء

سید امجد، پاکستانی ادب، دستکاریوں کی ثقافتی اہمیت، ترتیب و انتخاب رشید امجد، فاروق علی، ایس ٹی پرنٹرز، دریا آباد راولپنڈی، فروری ۱۹۸۲ء

صلاح الدین درویش، ڈاکٹر" جاگے ہیں خواب میں"، چند معنوی جہتیں، مشمولہ نقاط، فیصل آباد، شمارہ ۱۳، جون ۲۰۱۵ء

ضیاء الحسن، ڈاکٹر، مشمولہ جندرا ایک وجودی ناول، مکالمہ کراچی، کتابی سلسلہ ۳۶، مرتب مبین مرزا، لیزر پریس اردو بازار، کراچی، ستمبر ۲۰۱۷ء تا مئی ۲۰۱۸ء

قاسم یعقوب، لاشعور کی نفسیاتی گرہیں اور کہانی کا خواب، مدیر محمد سلیم فواد کندی، اردو سخن پاکستان آبشار شمارہ ۴، ضلع لیہ، فروری ۲۰۱۷ء

قدرت اللہ فاطمی (مشمولہ) پاکستانی ثقافت کی بنیادیں، مرتبہ رشید امجد، ۱۹۸۹ء

The Science of man in the world crisis R. Linton Ed Columbia University

Press, 1945